مبارک سفر کی زندہ اور شگفتہ رُوداد

حج بیتی

ناصر بشیر

کتاب ورثہ

ناصر بشیر کی "حج بیتی"

ناصر بشیر کسی تعارف یا تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ اردو کے استاد ہیں اور اب تک سینکڑوں کیا ہزاروں نوجوانوں کی "الف، ب" سیدھی کر چکے ہیں، لیکن استادی کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاعری میں بھی نام پیدا کیا ہے، اور ایک کالم نگار کے طور پر بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ روزنامہ "پاکستان" کے ساتھ ان کی وابستگی ہم سب "اہلِ پاکستان" کے لیے ایک اعزاز ہے۔

چند برس پہلے رمضان المبارک کے دوران مجھے امریکہ جانا پڑا، عیدالفطر بھی بوسٹن میں منائی وہاں کی عظیم الشان جامع مسجد میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ عید پڑھنے کا اپنا ہی مزا تھا۔ پاکستانیوں کی بڑی تعداد نے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا، لاہوریوں کی طرح چھپیاں ڈال کر بوسٹن کو لاہور بنا دیا۔ ناصر بشیر روزانہ ایک نعت کہہ رہے تھے، جو روزنامہ "پاکستان" کی زینت بن کر نشاطِ روح کا سامان کر رہی تھی۔ مَیں نیٹ پر اخبار پڑھتا اور سر دھنتا۔ ایک دن خیال آیا کہ ناصر صاحب کو ادارے کی طرف سے عمرے پر بھجوانا چاہیے۔ انہیں اس سے مطلع کیا تو وہ پھولے نہ سما پائے۔ عمرے کے اس سفر کی روداد انہوں نے لکھی، جو اخبار میں قسط وار چھپی اور پھر کتابی صورت میں ڈھل گئی۔ ان کے اس سفرنامے کو مَیں نے "نثری نعت" قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ اسے بھی بارگاہِ حق میں قبولیت کا شرف حاصل ہو گا۔ اس کا ثبوت یوں مل گیا کہ برادرم حاجی مقبول صاحب نے انہیں اپنے ادارے کی طرف سے حج کی پیش کش کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بار پھر مدینے کی فضاؤں میں اڑتے پائے گئے۔ اس "حج بیتی" کو بھی انہوں نے قلم کی زبان دے دی ہے۔ وہ اپنے قاری کو اس طرح اپنا رفیق بناتے ہیں کہ وہ خود اس مبارک سفر کا مسافر بن جاتا ہے۔ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ ناصر بشیر کی جگہ وہ خود حج کر رہا ہے۔ حج کے سفرنامے بہت لکھے گئے اور بہت لکھے جائیں گے لیکن ناصر بشیر کی "حج بیتی" اپنی بے ساختگی کی وجہ سے یاد رہے گی۔ "حج بیتی" پڑھنے والے ہر شخص کو یہ "ہڈ بیتی" محسوس ہوتی ہے اور وہ سراپا دعا بن جاتا اور ناصر بشیر کا یہ شعر گنگناتا ہے:

دل مدینے کا ہوا اور مدینہ میرا
شکر الحمد کہ روشن ہوا سینہ میرا

مجیب الرحمٰن شامی
01/06/2018

For Book Lovers
Kitab Virsa
Ghazni Street, Urdu Bazar Lahore
www.kitabvirsa.com
kitabvirsa@gmail.com - 0333-4377794

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حج بیتی

ناصر بشیر

مبارک سفر کی زندہ اور شگفتہ رُوداد

حج بیتی

ناصر بشیر

کتاب وِرثہ

غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

kitabvirsa@gmail.com

کتاب سے محبت کرنے والوں کے لیے

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں

اہتمامِ اشاعت

مظہر سلیم مجوکہ

ضابطہ

سالِ اشاعت:	رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ/مئی 2018ء
نام کتاب:	حج بیتی (مبارک سفر کی زندہ اور شگفتہ رُوداد)
صاحبِ کتاب:	ناصر بشیر 0333-4339350
	nasirbashir1968@gmail.com
ناشر:	کتاب ورثہ
	غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور 0333-4377794
مطبع:	حاجی حنیف اینڈ سنز، لاہور
قیمت:	400روپے

حج آرگنائزرز ایسوسی ایشن پاکستان (ہوپ)

کے سابق چیئرمین

حاجی مقبول احمد

کے نام

فہرست

نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہی تو میں مقبول ہو گیا

1

میں نے کتنے ہی لوگوں کے قصے سن رکھے تھے جن کے پاس پیسہ بھی تھا، وقت بھی تھا، ارادہ بھی تھا، نیّت بھی تھی لیکن انھیں حج کی سعادت حاصل نہ ہو سکی، کئی ایسے لوگ بھی یاد آئے جو پیسے اور وسائل کے بغیر ہی حج کر آئے، اب اپنی کہانی سے مجھے یقین آیا کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید جانتا ہے، ان کہی سنتا ہے اور بن مانگے دیتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے، اپنے بندوں کی مشکلیں حل کرنے کا وسیلہ بنا دیتا ہے

حیران کن واقعہ

یہ میری زندگی کا ایک حیران کن واقعہ ہے۔ اس واقعے سے مجھے یقین آیا کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید جانتا ہے، ان کہی سنتا ہے اور بن مانگے دیتا ہے۔

عمرے کے سفر کی روداد ''پہلی پیشی'' تازہ تازہ چھپ کر مارکیٹ میں آئی تھی۔ میں یہ کتاب جلد از جلد اپنے ان محسنوں تک پہنچا دینا چاہتا تھا جنھوں نے میرے اس سفر میں آسانیاں پیدا کرنے کی سچی کوششیں کی تھیں۔ میرے پرانے مہربان اور کتاب کے ناشر مظہر سلیم مجوکہ بھی میری خوشی میں برابر کے شریک تھے، چنانچہ وہ بھی ہر جگہ میرے ساتھ چلنے کو تیار تھے، یہ غالباً اگست 2017ء کے تیسرے ہفتے کی بات ہے، میں نے مجوکہ صاحب کے دفتر سے ''پہلی پیشی'' کی پندرہ بیس کاپیاں اٹھائیں، اُنھیں ساتھ لیا، منزل روزنامہ ''پاکستان'' کا دفتر تھا، جہاں محترم مجیب الرحمن شامی اپنے ٹی وی پروگرام ''نقطہ نظر'' کا ہوم ورک کر رہے تھے، اردو بازار سے نکلے تو شملہ پہاڑی آ نکلے، جہاں طواف ٹریولز کا دفتر ہے، حاجی مقبول احمد اس ادارے کے سربراہ ہیں۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ حاجی صاحب نے مجھے اور شبنم کو عمرے پر بھیجنے کا بندوبست کیا تھا، لیکن اتفاق دیکھیے کہ ابھی تک میری ان سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ کتاب کی ایک

کاپی حاجی مقبول احمد صاحب کی خدمت میں بھی پیش کردی جائے، چنانچہ مجوکہ صاحب کو اپنے ارادے سے آگاہ کیے بغیر مَیں طواف ٹریولز کے دفتر میں داخل ہوگیا، مجوکہ صاحب حیران پریشان تھے لیکن میرے پیچھے پیچھے چلے آئے، اعزاز سید صاحب حسبِ معمول تپاک سے ملے۔ اُنھوں نے کتاب دیکھی تو بولے: ''حاجی مقبول احمد صاحب اندر بیٹھے ہیں۔ انھیں ابھی اور اسی وقت اپنی کتاب پیش کردیں''۔ مَیں نے موقع غنیمت جانا اور جلدی سے حاجی صاحب کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ تعارف ہوا تو اٹھ کر کھڑے ہوگئے، کہنے لگے: ''آپ کا سفر نامہ، مَیں نے روزنامہ ''پاکستان'' میں پڑھا ہے، آپ کا اسلوبِ تحریر سادہ اور دل نشیں ہے۔ پڑھ کر مزہ آگیا''۔ یہ میرے لیے گرین سگنل تھا، مَیں نے ''پہلی پیشی'' کی ایک کاپی نکالی اور حاجی صاحب کے سامنے رکھ دی۔

''پہلی پیشی'' اور شامی صاحب

کتاب دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اس کتاب کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، سرورق دیکھا، پس ورق دیکھا تو شامی صاحب کی رائے پڑھنے لگے، انھوں نے لکھا تھا:

> ''یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ناصر بشیر زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نثر نگار ......غزل میں تو انھوں نے اپنا نقش جمایا ہی تھا، نظم میں انھوں نے مولانا ظفر علی خان کی پیروی کر کے دکھا دی ہے۔ حالاتِ حاضرہ پر روزانہ نظم لکھتے ہیں اور روزنامہ ''پاکستان'' کے قارئین سے داد پاتے ہیں، انھوں نے دو برس پہلے رمضان المبارک کے مہینے میں ہر روز نعت لکھ کر دربارِ رسالت مآب ﷺ میں

حاضری کی سعادت حاصل کی اور پھر رودادِ سفر ایک نئے جذبے اور شوق سے لکھ ڈالی۔ اس سفر نامے کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ سے گواہی ملتی ہے کہ یہ ایک مقدس سفر کا کوئی روایتی روزنامچہ نہیں ہے، اسے بجا طور پر ایک زندہ اور شگفتہ روداد کہا جاسکتا ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان کے دلوں میں وہ آتشِ شوق بھڑکا دیتی ہے جو دیارِ رسول ﷺ میں پہنچ کر ہی سرد ہوسکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح ان کے نعتیہ اشعار بارگاہِ رسالت ﷺ میں باریاب ہوئے تھے، ان کی یہ نثری نعت بھی شرفِ قبول حاصل کرے گی اور ان کے لیے دنیا و آخرت میں آسودگی کا سامان فراہم ہوگا''۔

حج پر جانے کے لیے تیار ہیں؟

حاجی صاحب جب یہ سب پڑھ چکے تو یک دم بولے: ''ناصر صاحب! کیا آپ اسی سال حج پر جانے کے لیے تیار ہیں''۔ ان کا سوال اتنا بے ساختہ اور اچانک تھا کہ میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی، خوشی کے مارے میری زبان گنگ ہوگئی۔ مَیں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا؟ شامی صاحب کی بات اتنی جلدی پوری ہوگئی! انھوں نے لکھا تھا: جس طرح ان کے نعتیہ اشعار بارگاہِ رسالت ﷺ میں باریاب ہوئے تھے، ان کی یہ نثری نعت بھی شرفِ قبول حاصل کرے گی''۔

یہ شرف قبول نہیں تو پھر کیا ہے؟ میں حاجی مقبول احمد صاحب کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا اور انھیں گلے سے لگا لیا۔ اور بولا: ''یہ دل کا دل سے وعدہ ہے،

اب ضرور پورا ہوگا''۔ مجوکہ صاحب مجھ دیوانے کی دیوانگی جسارت اور جرأت پر
انگشت بدنداں تھے، حاجی صاحب بولے: ''کل اپنا پاسپورٹ میرے دفتر میں
چھوڑ جایئے گا''۔

حاجی صاحب کے دفتر سے نکل کر مَیں اور مجوکہ سیدھے شامی صاحب کے پاس
جا پہنچے، مَیں نے انھیں حاجی صاحب سے ملاقات کا سارا احوال سنایا تو بولے:
''آپ انھیں کہتے کہ مَیں حج پر اکیلا نہیں جاؤں گا، اپنی بیگم کو بھی ساتھ لے کر
جاؤں گا''۔

''شامی صاحب! پہلی ہی ملاقات میں، حاجی صاحب کے سامنے اتنی بڑی
خواہش کس طرح رکھ سکتا تھا؟ ہاں اگر آپ کی حاجی صاحب سے بات ہو تو آپ
سفارش کر دیجیے گا''۔ مَیں نے کہا۔ پھر کہنے لگے: ''آپ ایک بار کہہ کر دیکھیں،
وہ آپ کی بات مان لیں گے۔ مجھے ایک بار سعودی حکومت نے حج کی دعوت دی
تھی، مَیں نے انھیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ حج کروں گا تو اپنی شریکِ حیات
کے ساتھ کروں گا''۔ ''پھر کیا ہوا تھا؟'' مَیں نے دریافت کیا تو بولے: ''وہی ہوا
جو مَیں نے سوچا تھا، بیگم صاحبہ میرے ساتھ گئیں''۔

شوقِ سفر

گھر پہنچا تو حاجی مقبول صاحب کی طرف سے پیغام ملا کہ حج آرگنائزرز
ایسوسی ایشن آف پاکستان (ہوپ H.O.A.P) پنجاب کے چیئرمین طالب
حسین صاحب کو پاسپورٹ، شناختی کارڈ کی کاپی اور چھے تصویریں پہنچا دوں، مجھے
جب یہ پیغام ملا، تب مَیں مجوکہ صاحب کے گھر بیٹھا تھا جو ضرار شہید روڈ پر رینجرز
ہیڈ کوارٹرز کے قریب تھا، طالب حسین صاحب سے فون پر بات ہوئی تو پتا چلا کہ

ان کا دولت خانہ بھی یہیں قریب ہی ہے، پاسپورٹ گھر میں رکھا تھا، سو بھاگم
بھاگ گھر پہنچا، مطلوبہ چیزیں لیں اور طالب صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔
کوئی اور کام ہوتا تو شاید غصہ آتا کہ خواہ مخواہ اتنی طویل مسافت طے کرنا پڑی لیکن
یہ میرا شوقِ سفر تھا جس نے مجھے سرپٹ دوڑایا، میرا سفرِ حج شروع ہو چکا تھا، حج
تکالیف اور مصائب کو برداشت کرنے کا نام ہی تو ہے۔ طالب حسین صاحب سے
مل کر گھر پہنچا تو مَیں اپنے بستر پر لیٹ کر سوچ رہا تھا کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خاص
کرم ہے کہ کوئی درخواست دی نہ رقم جمع کرائی، قرعہ اندازی کے جھنجھٹ میں پڑا
نہ سفارش کرائی، سب کچھ آپ ہی آپ ہوگیا، بیش تر حج پروازیں جا چکی تھیں،
دو چار پروازیں باقی تھیں، خیال آیا کہ یہ کہیں خواب ہی نہ ہو، لیکن پھر خود ہی دل
کو تسلی دی کہ ہر خواب کی اک تعبیر بھی تو ہوتی ہے۔

طالب حسین صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ 26 اور 30 اگست کے درمیان
آپ کی روانگی ہوگی۔ چنانچہ مَیں نے فوری طور پر ہائر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں
پچاس دن کی چھٹی اور این او سی کے لیے درخواست جمع کرا دی، اب حج اور عمرے
کی چھٹی کے لیے ہوم ڈیپارٹمنٹ اور سپیشل برانچ کے این او سی کی شرط ختم کر دی
گئی ہے اس لیے یہ مرحلہ جلد ہی طے ہوگیا۔ شبنم خوش تو تھی لیکن عمرے کی طرح
اس بار بھی اس کی تمنا تھی کہ میرے ساتھ جاتی لیکن اس بار اس نے اپنے آنسو
روک لیے، مَیں نے حج پر جانے کی اطلاع سب سے پہلے اپنے والدین کو دی،
پھر بہن بھائیوں کو بتایا، میرے چاروں بچوں، اجالا، احسن، جواد اور ارفع کا کہنا
تھا کہ ابھی حج پر جانے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے، لیکن شبنم کا مشورہ صائب
تھا۔ اس کا کہنا تھا: ''سب کو بتا دیں کیونکہ جس جس کو آپ کے حج پر جانے کی خبر
ملے گی آپ کے لیے دعا ضرور مانگے گا، یوں آپ کا کام جلد از جلد ہو جائے گا''۔

نثری نعت قبول ہوگئی

ایسا ہی ہوا، تیسرے چوتھے دن طالب حسین صاحب نے خوش خبری سنائی کہ 30 اگست کی صبح روانگی ہوگی۔ ائر بلیو کا جہاز مدینہ مَنّورہ لے جائے گا اور سات ستمبر تک وہیں قیام رہے گا، میری نثری نعت بھی مقبول ہوگئی تھی:

نعتِ نبی ﷺ کہی تو میں مقبول ہوگیا
دستار میں لگا ہُوا اک پھول ہوگیا
کُھلتے ہی آنکھ مسجدِ نبوی کی سمت جاؤں
ناصر بشیر یہ مرا معمول ہوگیا

عمرے کے لیے گیا تو مدینہ مَنّورہ سے واپسی پر یہ شعر ہوا تھا:

دل مدینے ہی میں رہ جائے گا، مَیں جانتا تھا
یہ مرے ساتھ نہیں آئے گا، مَیں جانتا تھا

سو اب مَیں اپنے کھوئے ہوئے دل کی تلاش میں دوبارہ نکلنے والا تھا۔ جب مَیں نے خیال ہی خیال میں مدینے کی طرف آغازِ سفر کیا تو یہ شعر ہوگئے:

دل مدینے کا ہوا اور مدینہ میرا
شکر الحمد کہ روشن ہوا سینہ میرا
آپؐ کے نام سے آغازِ سفر کرتا ہوں
اب نہ ٹھہرے گا محبت کا سفینہ میرا

مَیں جوں جوں اس سفرِ سعادت کے بارے میں سوچتا جاتا توں توں حیرتوں کے پہاڑ میرے سامنے آن کھڑے ہوتے، مَیں نے کتنے ہی لوگوں کے قصے سن رکھے تھے جن کے پاس پیسہ بھی تھا، وقت بھی تھا، ارادہ بھی تھا، نیّت بھی تھی لیکن

انھیں حج کی سعادت حاصل نہ ہوسکی، کئی ایسے لوگ بھی یاد آئے جو پیسے اور وسائل کے بغیر ہی حج کر آئے، اب اپنی کہانی سے مجھے یقین آیا کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید جانتا ہے، ان کہی سنتا ہے اور بن مانگے دیتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے، اپنے بندوں کی مشکلیں حل کرنے کا وسیلہ بنا دیتا ہے۔ میرے لیے اللہ تعالیٰ نے حاجی مقبول احمد کو وسیلہ بنایا تھا، ان کے نام کا مطلب ہی ''قبول کیا گیا ہے'' تو پھر کس طرح ہوسکتا ہے کہ انھوں نے میرے لیے جس خواہش کا اظہار کیا تھا، خدا اسے رد کر دیتا۔

حاجی احسان کے قیمتی مشورے

روانگی سے چار دن پہلے صُفہ ٹریولز والے حاجی احسان اللہ صاحب کا فون آیا، انھوں نے نہایت قیمتی مشورے دیے، حتیٰ کہ حج کے لیے درکار تمام ضروری سامان بھی فراہم کر دیا۔ حاجی احسان اللہ صاحب حج آرگنائزرز ایسوسی ایشن آف پاکستان پنجاب کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ''ہوپ'' نے پرائیویٹ اسکیم کے حاجیوں کی مکّہ مکرمہ اور مدینہ منوّرہ میں راہ نمائی کے لیے ملک بھر سے اَسّی (80) افراد کو چُنا ہے، یہ سب لوگ وہاں پاکستانی اور غیر پاکستانی حاجیوں کی کس طرح خدمت کرتے ہیں؟ آپ کو ہم یہی دکھانا چاہتے ہیں، کیونکہ آپ کا دیکھا ہوا، ہزاروں لوگ دیکھتے ہیں۔ آپ نے عمرے کے سفر کی نہایت دل کش روداد لکھی، ہم جانتے ہیں کہ آپ حج کی روداد بھی اسی محبت اور عقیدت سے لکھیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ حج عمرے کا کاروبار صرف کاروبار نہیں، خدمت بھی ہے، روانگی سے دو دن پہلے مَیں اپنے والدین کے پاس ملتان جا پہنچا جن کی دعاؤں کے باعث میری راہ کا ہر پتھر، خس و خاشاک کی طرح ہوا میں اڑ جاتا ہے

جن کی دعاؤں سے مال و دولت، شہرت و عزت اور علم کے خزانے آپ ہی آپ میری جھولی میں آ گرتے ہیں۔ بہن بھائیوں سے ملا، لاہور واپس آیا تو مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا حج ہوگیا ہے لیکن آتشِ شوق ابھی بھڑک رہی تھی، وہی آتشِ شوق جو روضہ رسول ﷺ اور خانہ کعبہ کے سامنے جا کر سرد ہوتی ہے۔

۞۞۞

تاجدارِ حرم کی نگاہِ کرم ہوگئی

2

سعودی عرب جا کر کوئی غصے میں نہ آئے۔ ویسے بھی حج تکالیف اور مصائب برداشت کرنے کا نام ہے اس لیے میں نے دارالبرہ کو دارالرحمت سمجھا۔ مجھے تو مدینے کی گلیوں، فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر بھی رہنے کی جگہ مل جائے تو اسے اللہ کی رحمتِ خاص ہی جانوں گا۔ کیونکہ مدینے کا بلاوا ہر شخص کو نہیں آتا اور میں تو یہاں دوسری بار آیا تھا۔ ویسے بھی مدینے میں آ کر کمرے میں کون رہنا چاہے گا

ناصر بھائی کو لے چلو

اس بار بھی وہی ہُوا جو عمرے پر روانگی سے پہلے ہوا تھا۔ گھر میں پھولوں اور مٹھائی کے ڈبوں کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک عام آدمی بیٹھے بٹھائے سب کے لیے وی آئی پی ہو گیا تھا۔ 29 اگست کی شام کو سنت نگر میں واقع میرا چھوٹا سا گھر لوگوں سے بھرا ہُوا تھا۔ رات گیارہ بجے مجھے ائر پورٹ کے لیے نکل جانا تھا اس لیے ہر شخص مجھ سے ملنے کا آرزومند تھا۔ میرے چھوٹے بھائیوں عامر بشیر، طاہر بشیر اور واجد بشیر کے علاوہ شبنم کی سہیلیاں اور ان کے بچے بھی موجود تھے۔ میرے ساتھ دھڑا دھڑ سیلفیاں اور تصویریں بنوائی جا رہی تھیں۔ محلے کی وہ خواتین جن کو میں نے کبھی نظر بھر کے نہیں دیکھا تھا، آج وہ بھی کیمرے کے فریم میں موجود تھیں۔ ساڑھے دس بجے احسن اور جواد نے بتایا کہ رمیز اپنے کزن عادل چشتی کے ساتھ آپ کو ائر پورٹ لے جانے کے لیے آ گیا ہے۔ گاڑی کے آنے کی اطلاع پاتے ہی گھر میں موجود خواتین، مردوں اور بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ گھر میں دیر سے میت پڑی ہو اور جنازہ لے جانے کے لیے ایمبولینس آنے کی خبر ملے تو گھر کی عورتیں بالکل اسی طرح شور مچاتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ شور مچانے سے شاید مردہ زندہ ہو جائے گا اور رُک جائے گا لیکن جسے جانا ہوتا ہے، وہ چلا ہی جاتا ہے:

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی

جب اسی شور شرابے میں کسی نے چلا کر کہا کہ ناصر بھائی کو لے چلو، ناصر بھائی کو لے چلو، تو مجھے لگا کہ میں واقعی ایک میّت ہوں۔ چارپائی پر پڑا ہوا ہوں۔ چپ چاپ سب کی آوازیں سُن رہا ہوں۔ جب کوئی شخص مر جاتا ہو گا اور اس کی میّت گھر میں پڑی ہوتی ہو گی تو وہ بھی اسی طرح سب کچھ سنتا ہو گا لیکن منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جب میں اپنا دستی تھیلا اٹھائے بالا خانے سے گلی میں اترا تو یوں لگا جیسے سارا محلہ مجھے الوداع کرنے کے لیے امنڈ آیا ہے۔ کچھ چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ کچھ مجھ سے گلے ملے۔ یہ تو جنازہ اٹھانے کا منظر تھا جو میں نے کئی بار دیکھا ہے۔

اُجالا رو رہی ہے

جب میں عادل کی گاڑی میں سوار ہونے لگا تو فضیلت بولی: ''بھائی جان! اُجالا رو رہی ہے۔ اسے تو ایک بار دیکھ لو'۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ دروازے کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ میں جلدی سے اس کے پاس گیا۔ گلے سے لگایا اور تسلی دی کہ میں ضرور واپس آؤں گا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ کہیں بھی کسی انسان کو دبوچ لیتی ۔ میرا بھی کیا پتا تھا کہ حج سے زندہ سلامت واپس آؤں گا یا نہیں؟ لیکن اپنی بیٹی اُجالا کے آنسو اور اپنے لیے اس کا پیار دیکھ کر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر سرزمینِ حجاز میں مر بھی گیا تو پلٹ کر ضرور آؤں گا۔ چھوٹی بیٹی ارفع کی بھی اُجالا والی کیفیت تھی لیکن وہ روئی نہیں۔ احسن اور جواد جو شہر میں ہونے والی اکثر ادبی و ثقافتی تقریبات میں میرے ساتھ جاتے ہیں۔ چپ کھڑے سوچ رہے تھے کہ بابا کو کیا ہو گیا؟ عمرے پر بھی ہمیں لے کر نہیں گئے۔ اب حج پر بھی

ہمارے بغیر جا رہے ہیں۔ وہ بار بار ایک ہی فرمائش کرتے رہے کہ سعودی عرب سے ان کے لیے اچھے سے موبائل ضرور لاؤں۔ وہ اس لیے بھی خوش تھے کہ وہ مجھے ائرپورٹ چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے۔ میرے برادرِ نسبتی اشرف کا بیٹا احمد بھی ان کے ساتھ تھا۔ رمیز اور عادل کے ساتھ ائرپورٹ کی طرف نکلا تو علاقے کے ایم پی اے اور نہایت صاحبِ ذوق آدمی برادرم ماجد ظہور کا فون آ گیا کہ جاتے ہوئے ان سے ملتا جاؤں۔ باغِ جناح کے کاسمو پولیٹین کلب کے سامنے، تعلیمی بورڈ کے امتحانی مرکز کے عقب میں ان کا ڈیرا ہے جہاں وہ سیاست کے جھمیلوں سے بچ کر سکون کے چند لمحے گزارتے ہیں۔ پرواز چونکہ صبح پانچ بجے تھی اس لیے میرے پاس خاصا وقت تھا۔ ماجد ظہور کے پاس ان کے چند دوست بیٹھے تھے۔ دسترخوان بچھا ہوا تھا لیکن ہم نے صرف کھجوریں کھانے پر اکتفا کیا۔ بچوں کو ماجد بھائی نے بڑے بڑے چاکلیٹ دیے۔ یہاں یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ ماجد بھائی بھی دو چار دن پہلے عمرہ کر کے وطن واپس لوٹے تھے۔

تاجدارِ حرم کی نگاہِ کرم

یہاں سے نکل کر ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے تو عادل چشتی نے مشہور قوالی ''تاجدارِ حرم'' لگا دی۔ غلام فرید صابری اور مقبول صابری قوال بچپن ہی سے میرے پسندیدہ رہے ہیں اس لیے میں نے عادل سے درخواست کی کہ ائرپورٹ تک بار بار یہی قوالی چلائیں۔ یہ قوالی پہلے بھی ہزاروں مرتبہ سنی ہے لیکن اس روز اس نے کچھ زیادہ ہی مزہ دیا۔ مجھ پر تاجدارِ حرم کی نگاہ کرم جو پڑ گئی تھی۔ مجھے انھوں نے بُلا لیا تھا۔

ائرپورٹ پہنچے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میرا سامان اتارا جا چکا تو میں

نے رمیز اور عادل کو واپس جانے کو کہا، کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ جواد، احسن اور احمد کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ مرکزی لاؤنج کے سامنے زیادہ وقت کے لیے گاڑی کھڑی کرنے کی اجازت بھی نہیں اس لیے رمیز اور عادل بچوں کو لے کر واپس چلے گئے۔ اتنے بھرے پُرے ائرپورٹ پر میں یک دم اکیلا ہو گیا تھا۔ دُور دُور تک کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے رہ رہ کر آج موت یاد آ رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں مُردہ ہوں اور اعزا و اقارب اور دوست احباب مجھے دفنا کر چلے گئے ہیں اور مَنوں مٹی تلے پڑا منکر نکیر کا انتظار کر رہا ہوں۔ منکر نکیر تو وہاں کیا آتے۔ البتہ ہوپ (H.O.A.P) کے جنرل سیکرٹری شکیل صاحب دکھائی دیے۔ انھیں وہاں موجود پا کر مجھے یقین آ گیا کہ واقعی حج کرنے جا رہا ہوں کیونکہ میرا ٹکٹ ان کے پاس تھا۔ چند لمحوں میں حاجی طالب حسین بھی وہاں آ گئے۔ طالب صاحب نے اپنے لوگوں سے مختصر خطاب کیا جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ سعودی عرب جا کر کوئی شخص غصے میں نہیں آئے گا۔ لوگ وہاں جا کر غصے میں آئے یا نہیں؟ یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ ہوپ پنجاب کی طرف سے تقریباً پندرہ لوگ تھے جنھیں مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ میں حجاج کرام کی خدمت اور راہ نمائی کے لیے چنا گیا تھا۔

خدشات، خطرات اور تحفّظات

جب تمام لوگ آ گئے تو ہم سب بورڈنگ کے لیے ائربلیو کے کاؤنٹر کے سامنے لگی لمبی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ائربلیو کے بارے میں کچھ خدشات، خطرات اور تحفظات دل میں تھے لیکن یہاں ان کی سروس دیکھ کر جی خوش ہوا۔ ان کے خوش اخلاق عملے نے ہر حاجی کو ایک ایک بیگ دیا جس میں پانی کی بوتل اور

چھتری کے علاوہ لنچ بکس بھی موجود تھا۔ سب کچھ مناسب تھا۔ پہلے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ائر بلیو والوں نے کھانا کیوں دیا ہے لیکن جب جہاز لیٹ ہوا تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ براہ راست مدینہ منوّرہ جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ احرام نہیں باندھنا پڑا۔ اگر ہم سیدھے مکّہ مکّرمہ جاتے تو لاہور ائر پورٹ ہی سے احرام باندھنا پڑتا۔ گویا ہم احرام کی ساری پابندیوں سے آزاد تھے۔ آسانی ہی آسانی تھی۔

جہاز مقررہ وقت سے تقریباً ایک گھنٹا تاخیر سے اُڑا لیکن ساڑھے چار گھنٹے میں اس نے ہمیں مدینہ منوّرہ کی پاک صاف اور شفاف فضاؤں میں پہنچا دیا۔ مدینے کی حدود میں پہنچ کر جہاز کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی اور جہاز خاصا نیچے بھی آ گیا تھا۔ میری سیٹ چونکہ حسبِ معمول کھڑکی کے پاس تھی اس لیے مجھے مدینے کی پہاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ائر بلیو کے اس جہاز میں اس وقت مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا کیونکہ جہاز کی رفتار بہت ہی کم تھی۔ بالکل اسی طرح، جیسے ریل گاڑی منزلِ مقصود پر پہنچتے ہی آہستہ ہو جاتی ہے اور مسافروں کے صبر کا امتحان لیتی ہیں۔ جہاز کافی دیر تک آہستہ آہستہ فضا میں تیرتا رہا۔ بال آخر جہاز کے پہیوں نے مدینہ منوّرہ کے ہوائی مستقر کی زمین کو چھوا اور میری جان میں جان آئی۔ سعودی وقت کے مطابق ہم صبح کے تقریباً نو بجے وہاں پہنچے تھے۔ حسبِ معمول امیگریشن اور کسٹم کے ضابطے پورے کیے۔ اگر چہ میرے پاس پولیو کے قطرے پینے کی سند موجود تھی لیکن سعودیوں نے اسے دیکھا تک نہیں۔ اپنے ہاتھوں سے قطرے پلائے۔ ایک گولی بھی دی جو ان کے سامنے پانی کے بغیر ہی نگلنا پڑی۔ ہر طرف سے فراغت پانے کے بعد ہم سب لوگ اپنے گروپ لیڈر شکیل صاحب کی قیادت میں مسافر خانے میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے میزبان ابھی تک نہیں پہنچے

تھے۔ شاید انھیں یقین نہیں تھا کہ ائر بلیو کا جہاز اتنی جلدی پہنچ جائے گا۔ اسی لیے وہ ہمیں لینے کے لیے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کے بعد ائر پورٹ پہنچے۔ مسافر خانے سے باہر نکلتے ہی جھلسا دینے والی دھوپ نے استقبال کیا لیکن یہ دھوپ بھی گھنے سائے کی طرح لگی۔ آخر مدینے کی دھوپ تھی۔ ایک بس ہمیں لے جانے کے لیے کھڑی تھی۔ ہمارے میزبان کے علم میں نہ تھا کہ ہمیں کہاں ٹھہرایا جائے گا۔ اس لیے وہ ہمیں پاکستان ہاؤس لے گیا۔ (یہ پاکستان ہاؤس کیا ہے؟ اس کے بارے میں آگے چل کر تفصیل سے لکھوں گا۔) پاکستان ہاؤس والوں نے بتایا کہ یہاں نہیں بلکہ ایک ہوٹل میں ہم سب کے قیام کا بندوبست کیا گیا ہے۔ چونکہ سب تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے جلد از جلد کمروں میں پہنچ کر آرام کرنا چاہتے تھے۔ دارالبرہ نام کی ایک عمارت کے سامنے ہم سب کو بس سے اتار دیا گیا۔ یہاں دو مناسب سائز کے دو کمرے ہمارے لیے بک کرائے گئے تھے۔ ایک میں نو بستر تھے اور دوسرے میں سات۔ میں نے سات بستروں والے کمرے میں اپنا سامان رکھا اور ایک بستر پر قبضہ جما لیا۔

دارالبرہ یا دارالرحمت؟

دارالبرہ کی طرف آتے ہوئے میں نے بس کی کھڑکی سے دیکھا تو الجزیرہ ہوٹل نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی ''البیک'' تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ تو وہی ہوٹل ہے جس میں، مَیں اور شبنم، بابا بشیر کی فیملی کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ دارالبرہ کوئی ہوٹل نہیں تھا، ایک مکان سا تھا جو حج کے دنوں میں حاجیوں کو سستے داموں کرائے پر مل جاتا ہے۔ یہ کمرا اگر چہ مجھے پسند نہیں آیا تھا لیکن مجھے حاجی طالب حسین کی بات یاد آ گئی کہ سعودی عرب جا کر کوئی غصے میں نہ آئے۔ ویسے بھی حج تکالیف اور

مصائب برداشت کرنے کا نام ہے اس لیے میں نے دارالبرہ کو دارالرحمت سمجھا۔ مجھے تو مدینے کی گلیوں، فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر بھی رہنے کی جگہ مل جائے تو اسے اللہ کی رحمتِ خاص ہی جانوں گا۔ کیونکہ مدینے کا بلاوا ہر شخص کو نہیں آتا اور میں تو یہاں دوسری بار آیا تھا۔ ویسے بھی مدینے میں آ کر کمرے میں کون رہنا چاہے گا۔ دارالبرہ اور مسجدِ نبویؐ کے درمیان بس ایک سڑک ہے اور آپ کو یہ سڑک انڈر گراؤنڈ راستے کے ذریعے عبور کرنا ہوتی ہے۔ میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ مسجدِ نبویؐ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ روز اُدھر جاؤں گا۔ سبز گنبد دیکھوں گا۔ روضہء رسولؐ کی جالیاں چوموں گا۔ میرے باقی ساتھیوں کے علم میں نہیں تھا کہ مسجدِ نبویؐ یہاں سے بہت قریب ہے اس لیے وہ ہوٹل کی ظاہری خوبیوں خامیوں پر بحث کرتے رہے۔ لیکن جلد ہی وہ بھی میری ہی طرح خوش ہو رہے تھے۔

میں پھر سے گنبدِ خضرا کو دیکھنے آیا

3

میرے ذہن میں کہیں یہ بات چپکی ہوئی ہے کہ رزق دینے والا، اللہ ہے اِسی لیے اسے رازق کہا جاتا ہے۔ مَیں ڈرتا ہوں کہ رزق اپنے ہاتھ سے تقسیم کر کے کہیں شرک کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ اس لیے مَیں نے کھجوروں سے بھرا ہُوا تھیلا مسجد کے ایک ستون کے قریب بنے ہوئے تھڑے پر رکھ دیا اور قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ لوگ قریب سے گزرے، لیکن کسی نے کھجوروں کے تھیلے کی طرف دیکھا بھی نہیں، لیکن جب مَیں نے وہاں سے گزرنے والوں کو کھجوریں اٹھانے کا اشارہ کیا تو بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق نہایت مہذب انداز میں کھجوریں اٹھائیں۔

کیا تم دیہاتی ہو؟

مدینہ مُنوّرہ میں پہلا دن کچھ ائر پورٹ پر گزرا، کچھ سڑکوں پر اور کچھ دارالبرہ کے کمرے میں، تقریباً چار بجے مَیں کمرے سے باہر نکلا اور ٹہلتے ٹہلتے ملک عبدالعزیز روڈ کے زیر زمین راستے کی طرف چل پڑا، بھوک لگ رہی تھی۔ایک پاکستانی ہوٹل میں داخل ہوا تو وہاں کھانا دستیاب تھا۔سعودی عرب میں ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کافی ہوتا ہے بلکہ اس میں سے بھی بچ جاتا ہے۔کھانا میرے سامنے آیا تو مَیں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک غریب حبشی کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔اُس کی مہربانی کہ اُس نے میری دعوت قبول کر لی اور کھانا کھانے لگا۔ جب ہوٹل کے بنگالی بیرے نے یہ منظر دیکھا تو قدرے غصے سے بولا: ''کیا تم دیہاتی ہو؟'' میری اس حرکت کی وجہ سے اُس کا کچھ نقصان ہو گیا تھا،لیکن ہم دونوں چُپ چاپ کھانا کھاتے رہے۔اب مَیں اس بیرے کو کیسے بتاتا کہ یہ ہمارے اُس پیغمبرؐ کا شہر ہے جس نے مواخات کا سبق دیا تھا۔مجھے حبشی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے بہت مزہ آ رہا تھا۔اسے دیکھ کر حضرتِ بلالؓ یاد آ رہے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد مَیں ملک عبدالعزیز روڈ کے زیر زمین راستے میں داخل

ہو گیا۔ برقی سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اُترا اور اوپر سڑک پر گیا۔سڑک پر کھڑے ہوتے ہی مسجدِ نبویؐ کے بلند و بالا مینار دکھائی دے رہے تھے۔ ہر آدمی اسی طرف جا رہا تھا سو میرے قدم بھی آپ ہی آپ مجھے اُدھر لے چلے۔راستے میں ایک جگہ موبائل فون کی دکان دکھائی دی جہاں سمیں بِک رہی تھیں۔ پہلے سعودی عرب میں سِم آسانی سے مل جایا کرتی تھی،لیکن اب اس کے لیے پاسپورٹ اور امیگریشن کارڈ دکھانا ضروری ہے۔میرے پاس یہ چیزیں موجود تھیں اِس لیے سم آسانی سے مل گئی۔فون میں ڈال کر اپنے والدین، بیگم اور بچوں کو خیریت سے سعودی عرب پہنچ جانے کی اطلاع دی۔کمال کی سم تھی۔کالز بھی کریں اور انٹرنیٹ بھی چلاتے جائیں۔مسجدِ نبویؐ کے سامنے پہنچا تو سبز گنبد میری آنکھوں کے روبرو تھا۔حیرت، محبت اور عقیدت میری آنکھوں میں اُمنڈ آئی۔آنسو اللہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔مَیں کافی دیر تک ایک ہی مقام پر کھڑے ہو کر سوچتا رہا کہ کیا یہ مَیں ہوں جو ایک بار پھر سبز گنبد کے سامنے آن کھڑا ہُوا ہے۔مَیں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ دوسرا بُلاوا اتنی جلدی آ جائے گا۔

جسے چاہا در پہ بُلا لیا جسے چاہا اپنا بنا لیا!
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ مَیں یہیں سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔مسجدِ نبویؐ کے اندر نہیں گیا۔کمرے میں جا کر نہایا۔تیار ہُوا۔نیا لباس زیب تن کیا۔عام طور پر خوشبو نہیں لگاتا،لیکن خوشبو بھی لگائی اور ایک بار پھر مسجدِ نبویؐ کی طرف چل پڑا۔مجھے یقین تھا کہ اُس وقت نبی پاکؐ مجھے دیکھ رہے تھے سو مَیں ہر طرح سے تیار ہو کر اُن کے روبرو جانا چاہتا تھا۔مغرب کی اذان ہونے والی تھی، مغرب اور عشا کی نمازیں باجماعت ادا کیں۔نمازوں کا مَیں یہاں تو ذکر کر رہا

ہوں لیکن آگے کوشش کروں گا کہ نمازوں کا ذکر نہ کروں، کیونکہ عبادت خالق اور مخلوق کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے اس لیے عبادت کا ذکر بار بار کر کے اپنی پارسائی کا اعلان نہیں کرنا چاہتا۔ نماز کے بعد اپنے بیگ میں موجود چھوٹی خالی بوتلوں میں آبِ زم زم بھرا اور دوبارہ بیگ میں رکھ لیں، کمرے میں واپس پہنچا تو بیگ کھول کر ایک بوتل نکالی اور مُنہ سے لگا لی۔ میرے ایک ساتھی نے مجھے کھڑے ہو کر پانی پیتے ہوئے دیکھا تو اُس نے بیٹھ کر پینے کو کہا لیکن جب مَیں نے بتایا کہ یہ آبِ زم زم ہے تو وہ چُپ ہو گیا۔ آبِ زم زم کے بارے میں حکم ہے کہ کھڑے ہو کر پیا جائے۔

عبادت بھی اور کمائی بھی

اگلے روز سو کر اُٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سارے بستر خالی تھے۔ دوسرے کمرے میں گیا تو وہاں تالا لگا ہُوا تھا۔ گویا وہ سب بھی جا چکے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ رات کو ہمارے گروپ لیڈر شکیل صاحب نے تمام حاجیوں کو پانچ پانچ سو ریال دیے تھے اور کہا تھا کہ یہ آپ کا ایک ہفتے کا جیب خرچ ہے اور ہر ہفتے آپ سب کو پانچ پانچ سو ریال دیے جائیں گے۔ یہ رقم ہوپ کی طرف سے فراہم کی گئی تھی۔ تمام دوستوں کی مسجدِ نبویؐ کے اردگرد ڈیوٹیاں لگائی گئی تھیں۔ سب کو ایک جیکٹ اور پی کیپ بھی دی گئی تھی جس پر پاکستان کا پرچم بنا ہُوا تھا اور جلی حروف میں H.O.A.P لکھا ہُوا تھا۔ مَیں بھی اپنے دوستوں کی طرح مسجدِ نبویؐ میں ڈیوٹی کرنا چاہتا تھا، لیکن حاجی مقبول احمد صاحب نے شکیل صاحب کو میرے بارے میں خاص ہدایات دی تھیں اور کہا تھا کہ ناصر صاحب کے لیے ڈیوٹی کا کوئی خاص مقام مقرر نہیں۔ یہ جہاں چاہیں، جائیں، گھومیں، پھریں۔ یہی ان کی ڈیوٹی

ہے میرے سارے ساتھی دراصل اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے تھے یا ڈیوٹی چارٹ وصول کرنے کے لیے گئے تھے، کیونکہ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ڈیوٹیاں تین شفٹوں میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ بعد میں یہی ہوتا رہا کہ دونوں کمروں میں ہر وقت دو چار ساتھی موجود رہتے، لیکن وہ سب سوتے رہتے۔ میرے سب ساتھیوں کے پاسپورٹ گروپ لیڈر شکیل نے اپنے پاس رکھ لیے تھے، لیکن میرا پاسپورٹ میرے ہی پاس رہنے دیا۔ اس کا سعودی عرب میں فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کسی بھی وقت کسی بھی علاقے میں بغیر کسی روک ٹوک کے سفر کر سکتے ہیں۔

تین ہزار روپے کی کھجوریں

ایک پاکستانی ہوٹل سے ناشتا کرنے کے بعد مسجدِ نبویؐ کی طرف چل پڑا۔ میرے برادرِ نسبتی اشرف نے مجھے تین ہزار روپے دیے تھے اور کہا تھا کہ کھجور مارکیٹ سے کھجوریں خرید کر مسجدِ نبویؐ میں تقسیم کر دوں۔ چنانچہ مسجدِ نبویؐ کے سامنے واقع کھجور مارکیٹ کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ کھجور مارکیٹ میں ریال کے علاوہ پاکستانی روپے بھی چل جاتے ہیں اِس لیے مَیں نے ایک پاکستانی دکاندار سے تین ہزار روپے کی دس کلو کھجوریں خریدیں اور مسجدِ نبویؐ کے اندر پہنچ گیا۔ میرے پڑھنے والوں کے لیے یہ بات شاید کوئی دلچسپ بات ہو کہ مَیں کھانے پینے کی چیزیں اپنے ہاتھ سے تقسیم نہیں کر سکتا۔ پتا نہیں کیوں مجھے حجاب آتا ہے، میرے ذہن میں کہیں یہ بات چپکی ہوئی ہے کہ رزق دینے والا، اللہ ہے اِسی لیے اسے رازق کہا جاتا ہے۔ مَیں ڈرتا ہوں کہ رزق اپنے ہاتھ سے تقسیم کر کے کہیں شرک کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ اس لیے مَیں نے کھجوروں سے بھرا ہُوا تھیلا مسجد کے ایک ستون کے قریب بنے ہوئے تھڑے پر رکھ دیا اور قریب ہی کھڑا ہو

گیا۔ لوگ قریب سے گزرے، لیکن کسی نے کھجوروں کے تھیلے کی طرف دیکھا بھی نہیں، لیکن جب مَیں نے وہاں سے گزرنے والوں کو کھجوریں اٹھانے کا اشارہ کیا تو بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق نہایت مہذب انداز میں کھجوریں اٹھائیں۔ البتہ خواتین نے شبنم کی طرح عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے اپنے ہینڈ بیگز میں کھجوریں بھر لیں۔ دو چار کھجوریں مَیں نے بھی کھائیں کیونکہ اب یہ کھجوریں کسی کی امانت نہیں تھیں، بلکہ میرے نبیؐ کا میٹھا تحفہ تھا جو وہ اپنے چاہنے والوں میں تقسیم کر رہے تھے۔

کھجور کی اہمیت

عرب کا مشہور شاعر احمد شوقی کھجور کے بارے میں کہتا ہے ''کھجور غریب آدمی کا کھانا ہے۔ یہ امیر آدمی کی مٹھائی ہے اور مسافر کا زادِ راہ ہے۔ کھجور کی اہمیت اور بھرپور غذائیت رسولؐ اللہ کے فرمان سے بھی واضح ہوتی ہے۔ ''جس گھر میں کھجور نہ ہو اس گھر والے بھوکے رہ جائیں گے'' اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر گھر میں کھجور ہو تو ہر وقت بھوک مٹائی جا سکتی ہے، یعنی اس میں بھرپور غذائیت موجود ہے۔

کھجور کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ غذا ہی نہیں زہر اور جادو کا علاج بھی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ''جو شخص صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھا لے، اسے اس دن کوئی زہر یا جادو نقصان نہ دے گا''۔

رسولؐ اللہ نے سحری میں کھجور کھانے کی ترغیب دلائی ہے۔ فرمایا: ''مومن کی بہترین سحری کھجور ہے''۔ آپؐ کی افطاری میں کھجور کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ جامع ترمذی میں ہے کہ نبی کریمؐ نماز سے پہلے چند تازہ کھجوریں کھا کر روزہ افطار

کرتے۔ اگر تازہ کھجوریں میسّر نہ ہوتیں تو خشک کھجوریں کھا کر افطاری کر لیتے اور اگر کھجوریں نہ ملتیں تو پانی کے چند گھونٹ پی لیتے''۔

سعودی عرب جا کر، میری طرح جو لوگ اپنے بیگ میں کچھ کھجوریں رکھتے ہیں وہ نہایت عقل مندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ بھوک لگے تو دو چار کھجوریں نکالیں اور بھوک مٹا لیں۔ کبھی کبھی آپ کا جسم خود بخود کسی میٹھی چیز کی طلب کرتا ہے۔ تب بھی کھجور کام آتی ہے۔ اشرف کی کھجوریں تقسیم کرنے کے بعد مَیں مسجدِ نبویؐ کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا، چونکہ نماز کا وقت ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی اِس لیے جگہ جگہ عرب قاری صاحبان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے خوبصورت رحل پر قرآن پاک کھلا رکھا تھا اور ہر قاری صاحب کے سامنے ایک قوس کی شکل میں مختلف ممالک کے لوگ رحلوں پر قرآن پاک رکھ کر چوکڑی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ قاری صاحبان انھیں قرآن پاک درست تلفظ کے ساتھ پڑھنا سکھا رہے تھے۔ مجھے یہ منظر بہت اچھا لگا۔ مَیں ایک قاری صاحب کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ انھوں نے مجھے اشارے سے خالی جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مَیں بیٹھ گیا۔ کھلی رحل پر قرآن پاک بند پڑا تھا۔ قاری صاحب سورۃ الفلق پڑھا رہے تھے۔ مَیں نے بھی وہی سورۃ نکال لی۔ وہ مختصر سی سورۃ بار بار پڑھا رہے تھا۔ قاری نوجوان تھا۔ عرب تھا۔ گویا اہلِ زبان تھا۔ درست لہجے اور تلفظ کے ساتھ قرآن پاک پڑھ سکتا تھا۔ بار بار سورۃ الفلق پڑھانے کے بعد انھوں نے وہاں موجود ہر آدمی سے وہ سورۃ سُنی۔ مَیں ڈر گیا کہ اب مجھے بھی اس امتحان سے گزرنا پڑے گا۔ غلطی ہو گئی تو میرا کیا بنے گا؟ یہ سوچ سوچ کر مَیں ہلکان ہُوا جا رہا تھا۔ وہاں کئی بنگلہ دیشی، انڈین اور حبشی موجود تھے۔ انھوں نے سورۃ الفلق کی تلاوت کرتے ہوئے تلفظ کی کئی غلطیاں کیں، لیکن قاری صاحب نے نہایت پیار اور محبت سے اُن کی

درستی کرا دی۔ یہ دیکھ کر میری جھجک ختم ہوگئی۔ میری باری آئی تو مَیں نے بالکل اُسی طرح سورۃ الفلق پڑھ دی جس طرح قاری صاحب نے پڑھی تھی۔

مکتبہ مسجد النبویؐ

سہ پہر کے وقت، مَیں مسجدِ نبویؐ کی زیارت کرتے کرتے ایک گوشے میں جا نکلا۔ ایک دروازے کے اوپر لکھا تھا: ''مکتبہ مسجد النبویؐ'' انگریزی میں LIBRARY بھی لکھا ہوا تھا۔ دروازے میں داخل ہوا تو برقی سیڑھیاں دکھائی دیں۔ اوپر پہنچا تو ایک نہایت شاندار کتب خانہ میرے استقبال کے لیے موجود تھا۔ زمین پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ نہایت عمدہ فرنیچر تھا، میزوں پر کمپیوٹر رکھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ کتابیں پڑھ رہے تھے اور کچھ کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ کتابیں نہایت سلیقے سے الماریوں میں پڑی تھیں۔ مجھے کسی کتاب پر گرد کا ایک ذرہ تک نظر نہ آیا۔ مَیں نے کچھ کتابیں یہ دیکھنے کے لیے الماری سے نکالیں کہ کوئی اہلکار مجھے منع کرتا ہے یا نہیں، لیکن کچھ بھی نہ ہُوا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا۔ وہاں بیٹھ کر آپ کسی بھی کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس لائبریری میں کوئی اخبار دکھائی نہیں دیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ مَیں نہیں جانتا۔ مسجدِ نبویؐ سے باہر نکلا تو بازار کی طرف چل پڑا ایک دکان سے جدّے سے ہر روز چھپنے والا اخبار ''اُردو نیوز'' خریدا۔ دکان سے لوگ کھانے پینے کی چیزیں خرید رہے تھے، لیکن مَیں نے اخبار کسی کو خریدتے نہیں دیکھا۔ جب مَیں عمرہ کرنے آیا تھا تو تب بھی مَیں ہر روز یہ اخبار خریدتا تھا، خود بھی پڑھتا تھا لوگوں کو بھی پڑھاتا تھا۔ اس میں مقامی خبروں کے ساتھ ساتھ پاکستان اور ہندوستان سے متعلق خبریں بھی بہت زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں۔ مَیں نے سنا ہے کہ اس کی اچھی خاصی سرکولیشن ہے۔ زیادہ

سرکولیشن کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ اخبار انٹرنیٹ پر موجود نہیں، اِس لیے جس کا اُردو مضامین، کالم، شاعری اور برصغیر پاک و ہند کی خبریں پڑھنے کو جی چاہتا ہے وہ دو ریال میں اخبار خرید لیتا ہے۔

آج سڑکوں پر مَیں اکیلا گھوم رہا تھا۔ پچھلی بار مدینے کی ہر گلی، ہر سڑک اور ہر بازار میں شبنم میرے ساتھ رہی۔ اب کے مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ حج کا فلسفہ ایک بار پھر کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ بیوی جو آپ کی ہر مشکل کو آسانی میں بدل دیتی ہے، حج کے لیے اسے بھی گھر میں چھوڑ کر آنا پڑتا ہے۔ ہاں وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اپنی بیوی کے ساتھ حج کرنے آتے ہیں۔

آپؐ کے شہر میں ہوتا میں کیسا ہوتا!

4

محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ محمود و ایاز یہاں پیدل ہی آئے تھے۔ سارے محمود اپنے ہاتھی گھر چھوڑ کر آئے تھے۔ نماز میں دلچسپی ہر مسلمان کو ہوتی ہے سو مجھے بھی ہے لیکن مجھے نمازیوں میں بھی دلچسپی رہتی ہے۔ میں ان کے چہرے دیکھ کر ان کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ کون حاضری کا قائل ہے اور کون حضوری کا۔

مزدور غائب ہو گیا

حج کے لیے بیوی بچوں ہی نہیں، ماں باپ اور بہن بھائیوں کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں آ کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ میں تو شہرِ نبیؐ میں تھا۔ یہاں بھلا کوئی کس طرح بے آسرا ہو سکتا ہے۔

اگلے دن مجھے یاد آیا کہ پروفیسر قدیر احمد صاحب نے لاہور سے روانگی سے ایک دن پہلے ڈیڑھ سو یورو دیے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اس رقم سے کھجوریں خرید کر ان کی طرف سے مسجدِ نبویؐ کے اندر تقسیم کر دوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ گنبدِ خضرا کے سامنے کھڑے ہو کر تقسیم کی جائیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ سو میں ایک بار پھر کھجور مارکیٹ کی طرف جا نکلا۔ بھاؤ تاؤ کر کے نہایت عمدہ کھجوروں کی ایک پیٹی خریدی جس میں شاید پچیس تیس کلو کھجوریں تھیں۔ دکاندار نے ایک مزدور کے سر پر یہ پیٹی رکھوائی اور بولا: ''یہ سروس مفت ہو گی''۔ مزدور کے لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سرائیکی ہے اور اس کا تعلق جنوبی پنجاب کے کسی چھوٹے شہر سے ہے۔ مجھے اپنائیت کے احساس نے جکڑ لیا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میں اس مزدور کو پانچ دس ریال ضرور دوں گا۔ مزدور نے مسجدِ نبویؐ کے گیٹ نمبر 6 سے داخل ہو کر 6 نمبر حمام کے سامنے کھجور کی پیٹی زمین پر رکھ دی۔ اس سے پہلے کہ میں اس

سے کوئی بات کرتا وہ بھاگ کر آبِ زم زم کے کُولر کی طرف لپکا۔ میں نے اسے آواز دی تو بولا کہ ابھی آ رہا ہوں لیکن پھر وہ اللہ جانے کہاں غائب ہو گیا کہ نظر ہی نہیں آیا۔ میں نے پیٹی کا منہ کھول دیا۔ چند ہی لمحوں میں پیٹی خالی ہو گئی۔ تھوڑی سی کھجوریں میں نے، اپنے ساتھیوں کے لیے الگ سے نکال لی تھیں۔ ایک خاتون نے جب کھجور کی پیٹی پڑی دیکھی تو وہ تیزی سے اُدھر آئی۔ پیٹی خالی دیکھ کر وہ پلٹنے لگی تو میں نے اپنے تھیلے میں سے اسے کچھ کھجوریں دیں۔ اس نے وہ اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالیں اور ہجوم میں کھو گئی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں بڑے سے بڑا شہنشاہ ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوتا ہے۔ یہاں ہاتھ پھیلانے والا، دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی رسوائی سے بچ جاتا ہے۔ یہاں کی گدائی پر بڑی سے بڑی بادشاہت قربان کی جا سکتی ہے۔ میری نعت کا ایک شعر ہے:

ناصر بشیر جو ہے گدائے درِ رسولؐ
قدموں میں اس کے دیکھی خدائی پڑی ہوئی

اپنا ہی ایک اور شعر یاد آیا:

ہاتھ میں کاسہ مرے جسم پہ جُبّہ ہوتا
آپؐ کے شہر میں ہوتا تو میں کیسا ہوتا

وعدے کا بوجھ

میرے پاس پروفیسر قدیر احمد صاحب کی کچھ رقم بچی ہوئی تھی۔ چنانچہ عصر کے بعد میں ایک بار پھر کھجور مارکیٹ میں جا پہنچا۔ دراصل میں وعدے کو بھی ایک بوجھ سمجھتا ہوں۔ وعدہ پورا کر کے ہی آپ اس بوجھ سے سبک دوش ہو سکتے ہیں۔ بچی ہوئی رقم سے میں نے عجوہ کھجور کی دو چھوٹی پیٹیاں خریدیں اور اپنے کاندھے پر رکھ

لیں۔ میں تو قلم کا مزدور ہوں۔ یہ کام میرے بس کا نہیں تھا لیکن شوق نے یہ بھی کروا دیا۔ میں دونوں پیٹیاں گنبدِ خضرا کے قریب لے آیا۔ ابھی زمین پر رکھی ہی تھیں کہ ایک عرب نوجوان میری طرف بڑھا اور عربی میں کچھ کہنے لگا۔ اس کے اشاروں سے اتنی بات میری سمجھ میں آئی کہ وہ اس جگہ کھجوریں بانٹنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ سو میں نے ہانپتے کانپتے سارا وزن ایک بار پھر اٹھا لیا۔ چند قدم چلنے کے بعد پیٹیاں ایک بار پھر زمین پر رکھ دیں۔ گنبدِ خضرا اب بھی میرے سامنے تھا لیکن وہ عرب نوجوان کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دونوں پیٹیاں کھول دیں۔ وہاں موجود لوگوں نے پلک جھپکتے ہی دونوں خالی کر دیں۔ یہ چونکہ عجوہ کھجور تھی اس لیے ہر شخص نے خوشی خوشی اٹھائی اور کھائی۔ عشا کی نماز کے بعد میں ہوٹل کی طرف چلا۔ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر لگتا تھا کہ اس دفعہ سارے عازمینِ حج کو شہنشاہِ مدینہ نے پہلے اپنے پاس طلب کر لیا ہے۔ یہاں یہ عالم ہے تو ان دنوں مکّہ مکرّمہ میں کیا حال ہوگا؟ حج کے موقع پر انتظامی مسائل سے نمٹنے کے لیے سعودی حکومت نے یہ حل نکال رکھا ہے کہ آدھے عازمینِ حج کو مکّہ مکرّمہ اور آدھوں کو مدینہ منّورہ کے ہوائی مستقروں پر اتارتی ہے۔ جو پہلے مکّہ مکرّمہ آتے ہیں وہ حج کرنے کے بعد مدینہ منّورہ بھیجے جاتے ہیں اور جو ہماری طرح پہلے مدینہ منّورہ آتے ہیں، چند دن یہاں قیام کے بعد حج کے لیے مکّہ مکرّمہ بھیج دیے جاتے ہیں۔

مدینہ منّورہ کا سستا بازار

ملک عبدالعزیز روڈ کے زیرِ زمین راستے سے گزر کر باہر نکلا تو عجیب منظر دکھائی دیا۔ ایک چھوٹا سا بازار سجا ہوا تھا۔ حبشی عورتوں اور مردوں نے زمین پر چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ پلاسٹک کی یہ ٹوکریاں تازہ پھلوں سے بھری ہوئی

تھیں۔ کسی کے پاس کوئی ترازو نہ تھا۔ بھاؤ تاؤ کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ ٹوکریوں کے قریب لکھ کر لگا دیا گیا تھا کہ یہ تین ریال کی ہے اور یہ پانچ ریال کی۔ یعنی ہر مال تین اور پانچ ریال میں آپ خرید سکتے تھے۔ سبزیاں بھی موجود تھیں۔ یہ غالباً بڑے سٹوروں کا بچا کھچا مال تھا جو ہر حال میں آج ہی بیچنا ضروری تھی، بصورتِ دیگر خراب ہوسکتا تھا۔ میں نے پانچ ریال میں انگور کی ایک ٹوکری خریدی۔ اتنے بڑے اور لذیذ انگور میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ دو ریال کے دو کیلے خرید لیے۔ کمرے میں پہنچا تو میرے ساتھی وہاں موجود تھے۔ میں نے انگور دھو کر کمرے میں پڑے چھوٹے فریج کے اوپر رکھ دیے تاکہ سب لوگ کھالیں۔ کچھ دوستوں کے لیے میں قدیر صاحب کی کچھ عجوہ کھجوریں لایا تھا۔ میں چونکہ چائے بہت شوق سے پیتا ہوں اس لیے ایک اسٹور سے ٹی بیگ، چینی اور خشک دودھ خرید لایا تھا۔ پانی گرم کرنے والی کیتلی پہلے سے اس کمرے میں موجود تھی۔ میں عام طور پر غروبِ آفتاب کے بعد چائے نہیں پیتا لیکن اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ سو گرما گرما چائے بنائی۔ چائے کا کپ لے کر میں ہوٹل کے استقبالیے کے قریب پڑے صوفے پر جا بیٹھا۔ چائے پی کر میں نے جیب سے گولڈ لیف کی ڈبی نکالی تو استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھے بنگالی لڑکے نے مجھ سے ایک سگریٹ مانگی۔ یہ لڑکا ہم سب سے بہت بے رُخی سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے سگریٹ مانگی تو میں نے ڈبی اس کے سامنے کر دی۔ اس نے صرف ایک سگریٹ نکالی۔ اور وہیں سُلگا کر پینے لگا۔ میں سگریٹ پینے کے لیے تخلیہ ڈھونڈتا ہوں۔ اٹھنے لگا تو وہ بنگالی بولا: ''یہیں پیو۔ کوئی تمھیں منع نہیں کرے گا''۔ میں نے جب دیکھا کہ لوہا گرم اور دل نرم ہے تو بولا: ''یار! وائی فائی کا پاس ورڈ تو بتا دو''۔

ارے یہ کیا! اس نے فوراً میرا فون پکڑا اور پاس ورڈ لگا دیا۔ میں حیران تھا کہ میرے سارے ساتھی دو دن سے اس سے وائی فائی کا پاس ورڈ مانگ رہے تھے لیکن اس نے کسی کو نہیں دیا۔ میں نے اس خوشی میں گولڈ لیف کی پوری ڈبی اس کے سامنے رکھ دی اور بادشاہوں کی طرح بولا: ''رکھ لو اپنے پاس''...... اُس نے کاندھے اُچکاتے ہوئے ڈبی اپنی جیب میں رکھ لی۔ سگریٹ کی کہانی بھی عجیب ہے۔ لاہور سے روانہ ہونے لگا تو جہاں بہت سے لوگ میرے لیے پھول، گل دستے اور مٹھائیاں لائے تھے، وہاں میرے ایک سیاسی دوست طارق سہیل بٹ عرف تارا بٹ گولڈ لیف کا پورا ڈنڈا اٹھا لائے۔ تارا بٹ یاروں کے یار ہیں۔ انھیں میرے حلقہء احباب اور دائرۂ محبت میں لانے کا سہرا میرے شاگرد اور دوست رمیز چشتی کے سر ہے۔ میں خود بھی گولڈ لیف کے دو ڈنڈے خرید کر ساتھ لایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ حج کے موقع پر اس بدشے سے دور ہو جاؤں۔ شاید اسی سوچ کے پیشِ نظر میں نے پوری ڈبی بنگالی لڑکے کے حوالے کر دی تھی۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ میں نے جب بھی دھواں اڑایا تارا بٹ کا نام میری دعاؤں میں شامل ہو جاتا۔

جنّت کا منظر

اگلے روز جمعہ تھا۔ نماز فجر کے لیے مسجدِ نبویؐ کی طرف چلا تو ایک خواب ناک منظر تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں سڑک پر نہیں روئی کے گالوں پر چلا جا رہا ہوں۔ یہ گناہوں سے لپٹی اور گناہ گاروں سے اٹی ہوئی دنیا نہیں تھی۔ جنّت تھی جنّت۔ ہلکی ہلکی خنکی، میٹھی میٹھی روشنی، دھیمی دھیمی ہَوا اور مسجدِ نبویؐ کی طرف جاتے ہوئے فرشتے۔ مجھے تو یہ سب لوگ اس وقت واقعی فرشتے لگ رہے تھے۔ ایک میں تھا جو

گناہ گار ہونے کے باوجود ان کے درمیان موجود تھا۔ ہری پگڑی والے اسحاق عطاری بھی میرے ساتھ تھے۔ مسجدِ نبویؐ کے اندر جا کر ہم الگ الگ ہو گئے۔ میں اپنے کسی جاننے والے کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا۔ شاید حاضری اور حضوری کا معاملہ ہے۔ آدمی چاہے باجماعت نماز ادا کرے لیکن جاننے والوں سے دور کھڑا ہو تو حاضری، حضوری میں بدل جاتی ہے۔ جمعتہ المبارک کی وجہ سے مسجد بھری ہوئی تھی۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ محمود و ایاز یہاں پیدل ہی آئے تھے۔ سارے محمود اپنے ہاتھی گھر چھوڑ کر آئے تھے۔ نماز میں دلچسپی ہر مسلمان کو ہوتی ہے سو مجھے بھی ہے لیکن مجھے نمازیوں میں بھی دلچسپی رہتی ہے۔ میں ان کے چہرے دیکھ کر ان کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ کون حاضری کا قائل ہے اور کون حضوری کا۔

دس گیارہ بجے کے قریب اپنے ہوٹل واپس پہنچا تو میں نے وائی فائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فیس بک کھول لی۔ بہت سے دوستوں نے مدینہ منوّرہ میں کھینچی ہوئی میری تصویروں پر ملے جلے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ اپنے حج پر توجہ دو۔ سیاحت مت کرو۔ اب انھیں کون بتاتا کہ حج صرف پانچ دن جاری رہتا ہے۔ باقی دنوں میں عبادت اور سیاحت ہی کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے مسجد نبویؐ کی لائبریری سے متعلق میری پوسٹ دیکھی تو انھوں نے لکھا: ''تم نے آخر اپنی پہچان برقرار رکھی ہے۔ تم نے کتاب خانہ تلاش کر ہی لیا۔ انڈونیشیا کے بوڑھے حاجیوں کے ساتھ میری تصویر دیکھ کر بھی انھوں نے مسرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے: ''اچھی بات ہے کہ تم حاجیوں کو دوست بنا رہے ہو''۔

اذانِ فجر سے پہلے میں جاگ جاتا ہوں

5

یہ صاحب جنّت البقیع سے مٹی سمیٹ کر ایک بہت بڑے تھیلے میں بھر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ پولیس کی نظر میں جُرم تھا۔ حاجی صاحب پر میں حیران تھا کہ انھوں نے پولیس کے سامنے ہاتھ جوڑے نہ معافی مانگی۔ انھیں خبر ہی نہ تھی کہ انھوں نے کوئی جرم کیا ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے اس عمل کو عقیدت پر محمول کیا جائے گا اور چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کے چہرے پر پریشانی کا تھوڑا سا تاثر اس وقت دکھائی دیا جب پولیس وہاں سے انھیں اپنے ساتھ لے جارہی تھی۔

''آپ کی ڈیوٹی کہاں ہے''؟

رات کے وقت موبائل فون پر وائی فائی آن کیا تو میرے وٹس ایپ پر دھڑا دھڑ میسج نوٹیفکیشن آنا شروع ہو گئے۔ وٹس ایپ کھول کر دیکھا تو پتا چلا کہ ''ہوپ'' والوں نے اپنا گروپ بنایا ہے اور مجھے بھی اس میں شامل کرلیا ہے۔ یہ تو ایک الگ ہی دنیا تھی۔ مختلف لوگوں نے وٹس میسج چھوڑ رکھے تھے۔ میں نے کئی وائس میسج سنے تو سن کر پتا چلا کہ یہ لوگ کس طرح کام کر رہے ہیں۔ چند ایک آپ بھی پڑھ لیں۔

O......میری ڈیوٹی مسجدِ نبویؐ کے گیٹ نمبر 6 کے قریب ہے۔ عطاری صاحب! آپ کی ڈیوٹی کہاں ہے؟

O......میری ڈیوٹی مسجد نبوی کے کتب خانے کے قریب ہے۔

O......یار! میں ایک بزرگ خاتون کو ان کے ہوٹل چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ان کے ساتھی، ان سے بچھڑ گئے ہیں۔ اس خاتون کے پاس ہوٹل کا کارڈ موجود ہے۔

O......میں ایک خاتون کو ''البیک'' کا راستہ دکھانے جا رہا ہوں کیونکہ اس کے ساتھی وہاں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

O......یار! ایک انڈین حاجی صاحب میرے پاس بیٹھے ہیں۔ انھیں بخار اور نزلے کی شکایت ہے۔ کیا آپ کے پاس انھیں دینے کے لیے کوئی دوا ہے؟

O......آپ انھیں پاکستان ہاؤس کیوں نہیں لے جاتے۔ وہاں ڈاکٹر صاحبان موجود ہیں۔ جو عازمینِ حج کا مفت چیک اپ کرتے ہیں اور مفت دوا دیتے ہیں۔

O......میں نے انھیں وہاں لے جانے کو کہا ہے لیکن یہ کہتے ہیں کہ انھیں پیناڈول مل جائے تو کافی ہے۔

O......اچھا تم بتاؤ کہ کہاں کھڑے ہو؟ میرے پاس پیناڈول موجود ہے۔

O......میں عین گنبدِ خضرا کے قریب کھڑا ہوں۔

O......اچھا میں آتا ہوں۔

O......ہوپ کے سارے کارکن ایک خاص قسم کے جذبے سے سرشار دکھائی دیتے تھے۔ وہ صرف پاکستانی عازمین حج کی راہ نمائی اور مدد کے لیے گئے تھے لیکن بنگلہ دیشی، بھارتی اور انڈونیشین حاجیوں کی بھی خدمت کر رہے تھے۔ ''ہوپ'' کے گروپ لیڈر شکیل نے رات کو مجھے ایسے کئی واقعات سنائے جن سے پتا چلا کہ وہ واقعی ڈیوٹی کر کے آ رہے ہیں۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ میں رات کو خواہ کتنے بجے ہی کیوں نہ سوتا۔ فجر کی اذان سے پہلے آپ ہی آپ آنکھ کھل جاتی۔ اس رات بھی ایسا ہی ہُوا۔ مسجدِ نبویؐ میں نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد میں جنّت البقیع میں داخل ہو گیا۔ ایک طرف تدفین کے لیے ایک میت دھری تھی۔ بہت سے لوگ اردگرد کھڑے تھے۔ دوسری طرف دیکھا تو اُدھر بھی مجھے لوگوں کا ہجوم نظر آیا لیکن میت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہاں پولیس والے بھی بہت متحرک دکھائی دے رہے تھے۔ میرا تجسس مجھے اسی طرف لے چلا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ایک پاکستانی حاجی صاحب کو پولیس نے پکڑ رکھا ہے۔ یہ صاحب جنّت البقیع سے مٹی سمیٹ کر ایک بہت بڑے تھیلے میں بھر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ پولیس کی نظر میں جُرم تھا۔ حاجی صاحب پر میں

حیران تھا کہ انھوں نے پولیس کے سامنے ہاتھ جوڑے نہ معافی مانگی۔ انھیں خبر ہی نہ تھی کہ انھوں نے کوئی جرم کیا ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے اس عمل کو عقیدت پر محمول کیا جائے گا اور چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کے چہرے پر پریشانی کا تھوڑا سا تاثر اس وقت دکھائی دیا جب پولیس وہاں سے انھیں اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔

جنّت البقیع کیا ہے؟

یہ مدینہ مَنّورہ کا خاص قبرستان ہے جو مسجدِ نبویؐ سے متصل ہے۔ اس میں تقریباً دس ہزار کے قریب صحابہ کرامؓ دفن ہیں۔ حضور پاکؐ کی بیویاں اور بیٹیاں بھی یہیں دفن ہیں۔ ہجرت کے وقت یہاں ایک میدان تھا جس میں لمبی لمبی گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ سب سے پہلے یہاں ایک صحابی عثمان بن مظعونؓ دفن ہوئے۔ ان کے بعد حضور پاکؐ کی صاحب زادیاں، پھر صاحب زادے ابراہیم اور ازواجِ مطہرات دفن ہوئیں۔ اسی وجہ سے اس کی عظمت بہت زیادہ ہے اور اسے جنّت البقیع کا نام دیا گیا۔ کسی زمانے میں یہاں حضرت امام حسنؓ کا مقبرہ خاصا شاندار تھا۔ سعودی حکومت نے جنّت البقیع میں موجود تمام مقبروں کو مسمار کر دیا۔ اب یہاں کچی قبریں ہیں، جن پر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کون سی قبر کس کی ہے؟ حلیمہ سعدیہ اور اصحابِ صُفّہ کی قبریں بھی جنّت البقیع میں ہیں۔ سعودی حکومت اس قبرستان میں صرف مُردوں اور مَردوں کو جانے کی اجازت دیتی ہے۔ زندہ عورتیں ہرگز اندر نہیں جا سکتیں اور اس پابندی پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔

بنگالی بازار میں چائنا کا مال

جنّت البقیع سے باہر نکلا تو مسجدِ نبویؐ کے اندر سے گزر کر بنگالی بازار کی طرف

چل پڑا۔ بنگالی بازار میں بنگالیوں اور بھارتیوں نے ہوٹل بنا رکھے ہیں جنھیں وہ پاکستانی ہوٹل کہتے ہیں۔ سری پائے، نہاری، نان چنے اور حلوہ پوری دیکھ کر سب کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ واقعی پاکستانی ہوٹل ہیں۔ بنگالی بازار میں قائم دکانیں بھی زیادہ تر بنگالیوں ہی کی ہیں۔ اتنے کٹھور ہیں کہ ایک ریال کی بھی رعایت نہیں کرتے۔ وہ بے چارے کریں بھی کیا؟ کاروبار کے اصل مالک تو عرب کفیل ہیں جنھوں نے ساری سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ یہ تو ان کے سیلز مین ہیں۔ بنگالی بازار کے آغاز میں سڑک کے درمیان ہزاروں جنگلی کبوتر ہر وقت غٹرغوں غٹرغوں کرتے اور دانہ چگتے نظر آتے ہیں۔ حبشی عورتیں دو، پانچ اور دس ریال میں دانے کی پوٹلیاں فروخت کرتی ہیں۔ لوگ ان سے دانے سے بھری پوٹلی خریدتے ہیں اور کبوتروں کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے بچے وہی دانہ دوبارہ اکٹھا کرتے ہیں اور نئی پوٹلیوں میں بھر کر دوبارہ فروخت کے لیے اپنی ماؤں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ ہزاروں جنگلی کبوتر ہر وقت یہیں رہتے ہیں۔ قریب ہی مسجدِ نبویؐ ہے۔ لیکن میں نے کبھی کسی کبوتر کو مسجدِ نبویؐ کے اوپر اڑتے نہیں دیکھا۔ کیا یہ معجزہ نہیں؟

گھوڑے بیچ کر سونے کی اداکاری

میں چائنا کے مال سے بھری دکانیں دیکھتے ہوئے چلتا جا رہا تھا جب احساس ہوا کہ اب مجھے ناشتا کر لینا چاہیے تو ایک پاکستانی ہوٹل کے اندر داخل ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں ''اردو نیوز'' تھا۔ یہ اخبار میں نے چند لمحے پہلے ہی ایک دکان سے دو ریال میں خریدا تھا۔ بیرا میرے آرڈر کے مطابق ناشتا میرے سامنے رکھ گیا اور مجھ سے پوچھے بغیر میرا اخبار اٹھا کر لے گیا۔ بولا: ''جب تک آپ ناشتا

کرتے ہیں، تب تک میں اخبار پڑھتا ہوں''۔ میں صبر شکر کے سوا اور کر بھی کیا سکتا
تھا۔ سو خاموش رہا۔ میں نے ناشتے میں چائے نہیں لی تھی۔ سو ایک بار پھر مسجدِ
نبویؐ کے اندر سے ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میرے کئی ساتھی
رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد گھوڑے بیچ کر سونے کی اداکاری کر رہے تھے۔
اداکاری میں نے اس لیے کہا کہ جونہی میں نے کمرے کا دروازہ کھولا، بلب جلایا
تو وہ سب جاگ گئے کسی نے کہا: ''دروازہ بند کر دو'' کسی نے کہا: ''بتی بجھا دو''۔
دراصل ان لوگوں کے ذہنوں میں کہیں یہ گِلہ موجود تھا کہ وہ تو پورے آٹھ گھنٹے
ڈیوٹی کرتے ہیں اور میں بس یونہی گھومتا پھرتا ہوں۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ میں ان
سے زیادہ جاگتا تھا۔ ان سے زیادہ گھومتا پھرتا تھا۔ انھی کی طرح بہت سے لوگوں
کی راہ نمائی کرتا تھا۔ بہرحال میں نے چپکے چپکے چائے کا کپ تیار کیا اور استقبالیہ
کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے بنگالی نوجوان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ یہ نوجوان مجھے اس لیے
بھی اچھا لگتا ہے کہ ہر وقت میرے پسندیدہ گلوکاروں ارونا لیلیٰ اور بشیر احمد کے
گائے ہوئے پاکستانی فلمی گانے سنتا رہتا تھا۔ کبھی ہیڈفون لگا کر کبھی اتار کر۔ دیوار
پر لگی ایل ای ڈی پر وہ پاکستانی اسٹیج ڈرامے بھی دیکھتا رہتا اور اکیلا ہی پاگلوں کی
طرح ہنستا رہتا۔ مجھے اس دوران میں مدینہ منوّرہ کے کئی ہوٹلوں میں جانے کا
اتفاق ہوا۔ ہر ایک کے استقبالیہ کاؤنٹر پر لگی ایل ای ڈی پر خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ
کی لائیو کوریج جاری تھی۔ یہاں عجیب معاملہ تھا۔ چنانچہ میں جب بھی اس کے
قریب بیٹھتا۔ اپنے موبائل فون پر ہیڈفون لگا کر غلام فرید صابری اور مقبول صابری
کی کوئی قوالی سننے لگتا۔ ان قوالیوں کا مدینہ منوّرہ میں، مسجدِ نبویؐ کی ہمسائیگی میں رہ
کر سننے کا اپنا ہی مزہ تھا۔

اللہ رے! مہمان نوازی کے یہ آداب!

6

میں اُحد کے میدان میں، پہلے بھی آ چکا تھا لیکن اب بھی جی
چاہتا تھا کہ اس کی پتھریلی اور گرم زمین پر ننگے پاؤں اور
ننگے سر پھرتا رہوں اور غزوۂ احد کو یاد کروں۔ میں جب بھی
یہاں آیا اپنے آپ کو غزوۂ احد کے سپہ سالار کا ادنیٰ سا سپاہی
محسوس کیا۔ مجھ کمزور سے آدمی کو اپنے اندر بجلیاں سی دوڑتی
محسوس ہوتی ہیں۔ ابھی سورج سر پر نہیں آیا تھا لیکن اس کے
باوجود یہاں شدید گرمی تھی۔

لفظ جب تک وضو نہیں کرتے

مجھے یونہی خیال آیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی، مدینے میں کوئی شاعر دوست بھی ہے یا نہیں؟ ذہن پر زور دیا تو یاد آ گیا کہ پی ٹی وی کے سینئر پروڈیوسر محسن جعفر کے پروگرام ''فردوسِ گوش'' میں ڈاکٹر خالد عباس الاسدی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ موبائل میں ان کا نمبر محفوظ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے بحرین میں مقیم اپنے شاعر دوست محمد ایوب صابر سے رابطہ کیا۔ انھوں نے خالد عباس الاسدی صاحب کا نمبر بھیج دیا۔ خالد صاحب سے رابطہ ہوا تو انھوں نے نہایت گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ بولے: ''ویسے تو آپ اللہ اور نبیؐ پاک کے مہمان ہیں لیکن آج رات آپ میرے مہمان ہوں گے''۔

انھوں نے مجھے رات آٹھ بجے مطعمِ طیبہ پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ ڈاکٹر خالد عباس الاسدی کے بارے میں بتاتا چلوں کہ ڈاکٹر صاحب پچھلے چالیس برس سے مدینہ منّورہ میں مقیم ہیں۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ مسجدِ نبویؐ میں بھی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ ان کا ایک نعتیہ شعر زبان زدِ عام ہے۔

لفظ جب تک وضو نہیں کرتے
ہم تری گفتگو نہیں کرتے

میں نے یہ شعر پہلی بار 1992ء میں ممتاز ماہرِ قانون، صحافی اور شکاری صفدر جاوید چیمہ کی زبانی سنا تھا۔ شاعر کا نام انھیں بھی معلوم نہیں تھا۔ میں مقررہ وقت پر مطعمِ طیبہ پہنچا تو ڈاکٹر صاحب ایک فیملی کیبن میں موجود تھے۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص سے ڈاکٹر صاحب کا پوچھا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے ان کے کیبن تک چھوڑ کر گیا۔ میرے پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے بیرے کو بُلا لیا۔ کھانے کا آرڈر دیا جا چکا تو خالد صاحب نے پاکستان کے دوستوں کا حال احوال پوچھنا شروع کر دیا۔ مجیب الرحمن شامی اور ناصر زیدی کا ذکر چل نکلا تو میں نے اپنا فون نکالا اور ناصر زیدی کا نمبر ملا دیا۔ زیدی صاحب غالباً سوئے ہوئے تھے۔ لیکن جب انھوں نے میری آواز سنی تو بہت خوش ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ میں حج کے لیے سعودی عرب آیا ہوا ہوں۔ مجھے دراصل ان کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا کہ انھوں نے دو چار دن پہلے میری کتاب ''پہلی پیشی'' پر ایک محبت سے بھرا کالم لکھا تھا۔ ڈاکٹر خالد عباس الاسدی کا نام سُن کر تو وہ ان سے بات کرنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ بات ہو چکی تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: ''شامی صاحب سے بھی بات کرا دوں؟'' بولے: ''نہیں یار! پاکستان میں اس وقت آدھی رات بیت چکی ہوگی۔ وہ سو رہے ہوں گے''۔

سمندر عطا ہوئے

جب بیرا کھانا ہمارے سامنے چُن کر چلا گیا تو حاجی مقبول احمد کا فون آ گیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ رات کے کھانے میں شریک کرنے کے آرزو مند تھے اور مجھے اپنے ہوٹل میں بُلا رہے تھے لیکن جب میں نے خالد عباس صاحب کے بارے میں بتایا تو انھوں نے میری معذرت قبول کر لی لیکن ڈاکٹر خالد کہنے لگے کہ حاجی مقبول

صاحب کو بھی بلا لیجیے۔ ذرا سے پس و پیش کے بعد حاجی مقبول صاحب نے ڈاکٹر
صاحب کی دعوت قبول کر لی۔ چند منٹ کے بعد وہ ہمارے پاس تھے۔ ان کے
ساتھ ان کے داماد حاجی محمد اسلام اور مدینہ منوّرہ میں ان کی ٹریول کمپنی کے انچارج
شیخ راشد علی بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ وہ حاجی مقبول
کے آنے پر بہت خوش تھے۔ گپ شپ شروع ہوئی تو حاجی صاحب نے انھیں
ہوپ کی معرکہ آرائیوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا
کہ وہ اس سال اسّی کے قریب خدّام کو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ جو اس وقت مدینہ
منوّرہ اور مکّہ مکرّمہ کے مختلف مقامات پر ڈیوٹی کر رہے ہیں۔ کھانے کے بعد شعر و
شاعری کا سلسلہ چل نکلا میں نے اپنی ایک غزل اور نعت کے کچھ اشعار سنائے
۔میں ڈاکٹر خالد عباس الاسدی سے ان کی شاعری سننا چاہتا تھا۔ حاجی مقبول نے
بھی میری تائید کی۔ خالد صاحب نے نعتیں بھی سنائیں اور غزلیں بھی۔ یہاں آپ
کے لیے میں ان کی سنائی ہوئی نعتوں کے چند اشعار درج کر رہا ہوں۔

جاں سے عزیز تر وہ حروفِ ثناء ہوئے
جو تیری بارگاہِ ادب میں ادا ہوئے
دشتِ طلب پہ ابرِ کرم یُوں برس پڑا
جیسے گداگروں کو سمندر عطا ہوئے
جب سے رواں ہیں آنکھ سے کوثر کے زمزمے
دل کی زمیں کے سارے شجر پارسا ہوئے

....

سلام روضہ ء اقدس پہ کر رہا ہوں میں
نظر کے جام کو زم زم سے بھر رہا ہوں میں

ستارے ناپ رہے ہیں مُسافتیں میری
یہ کس مقام سے یارب گزر رہا ہوں میں
کرم ہے صاحبِ کوثر کا کس قدر مجھ پر
کہ دشتِ روح کو سیراب کر رہا ہوں میں
سجی ہے تن پہ مرے خاکِ طیّبہ ایسی
کہ ذرّے ذرّے کی ضو میں نکھر رہا ہوں میں

ہماری یہ محفل رات بارہ بجے تک جمی رہی۔ مطعم طیبہ کا کھانا پاکستان کے کسی
بھی معیاری ہوٹل سے کم معیار کا نہ تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ہوٹل کا سارا عملہ
ڈاکٹر خالد عباس صاحب کا مطیع دکھائی دیا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اس
ہوٹل کا افتتاح انھی کے ہاتھوں ہُوا تھا۔

اپنے جیسے لوگوں کے درمیان

حاجی مقبول کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلا تو مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں مدینہ
منوّرہ میں نہیں، لاہور ہی میں ہوں۔ دل اپنائیت کے احساس سے سرشار تھا۔
حاجی صاحب مجھے اپنے ساتھ، اس ہوٹل میں لے جانا چاہتے تھے جہاں وہ
ٹھہرے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا ہوٹل نہایت عمدہ اور شاندار رہا ہو گا۔ میں
ایک غریبانہ سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے سارے ساتھی بھی وہیں تھے۔
حاجی صاحب میرے کمرے میں پہنچے تو کمرے کی صورتِ حال دیکھ کر
پریشان ہو گئے۔ اب ان کا اصرار بڑھ گیا کہ میں ان کے ساتھ ان کے ہوٹل میں
چلوں لیکن میں اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میں نے حاجی صاحب کو
اپنی غزل کا ایک شعر بھی سنا دیا۔

ذرا سی دیر رہوں گا تمھاری محفل میں
پھر اپنے جیسے ہی لوگوں میں لوٹ جاؤں گا

اس کمرے میں بیڈ زیادہ تھے، جگہ کم تھی۔ میں نے اپنے دو بیگ اپنے بیڈ پر ہی رکھے ہوئے تھے اور خالی جگہ پر کروٹ بدل کر سو جاتا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اسی میں مزہ آنے لگا تھا۔ یہ بات میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اللہ نبیؐ کے گھر میں آنے والوں کو بہت سی مشکلات برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ یہی تو امتحان ہے۔ میں اس امتحان میں پورا اترنا چاہتا تھا۔

حاجی مقبول کی آمد کی خبر پاتے ہی دوسرے کمرے سے بھی ہمارے سارے ساتھی آ گئے۔ گروپ لیڈر شکیل کو حاجی صاحب نے ہدایت کی کہ کل ناصر بشیر کو پاکستان ہاؤس لے جاؤ اور انھیں دکھاؤ کہ پاکستان سے آنے والے خدام ِکس طرح پاکستانی عازمینِ حج کی خدمت کرتے ہیں۔

اگلے روز نو بجے ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ بولا: ''میرا نام حضرت بلال ہے۔ میں آپ کو پاکستان ہاؤس لے کر جاؤں گا''۔ میں نے کہا: ''آپ وہاں پہنچ جائیں میں دو گھنٹے کے بعد ٹیکسی لے کر خود ہی پہنچ جاؤں گا''۔ وہ میرے فیصلے پر حیران تو ہُوا لیکن بے چارہ کیا کر سکتا تھا؟ سو وہ مجھے لیے بغیر ہی پاکستان ہاؤس چلا گیا۔ اس کے ساتھ میرے نہ جانے کا سبب یہ تھا کہ میں نے رات یٰسین صاحب اور عطاری صاحب کے ساتھ پروگرام بنایا تھا کہ ہم تینوں مدینہ مَنّورہ کے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے جائیں گے۔ ہم تینوں نے ایک پاکستانی ہوٹل سے ناشتا کیا اور ٹیکسی میں سوار ہو کر مسجدِ قبلتین جا پہنچے۔ مسجدِ قبلتین وہ مسجد ہے جہاں پہلی بار خانہ ءکعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی گئی تھی۔ یہ مسجد مدینہ مَنّورہ کے محلہ بنوسلمہ میں واقع ہے۔ دو ہجری میں حضرت محمدؐ اور صحابہ کرامؓ نے نماز کے

دوران میں اپنا رُخ بیت المقدس سے کعبے کی طرف پھیرا۔ کیونکہ ایک نماز دو مختلف قبلوں کی جانب رُخ کر کے پڑھی گئی اس لیے اس مسجد کو ''مسجدِ قبلتین''، یعنی دو قبلوں والی مسجد کہتے ہیں۔

غزوۂ احد کا سپاہی

دو دو نفل ادا کرنے کے بعد ہم میدان احد میں چلے گئے۔ جو مسلمان مدینہ مَنّورہ آتا ہے وہ احد کے میدان میں نہ جائے یہ ممکن ہی نہیں۔ جنگِ احد یہاں 7 شوال 3 ہجری کو مسلمانوں اور مشرکین مکّہ کے درمیان ہوئی تھی۔ مشرکین کے لشکر کی قیادت ابوسفیان کے پاس تھی اور اس نے 3000 سے زائد افراد کے ساتھ مسلمانوں پر باقاعدہ تیاری کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ مسلمان اس جنگ کے لیے تیار نہیں تھے لیکن حضور پاکؐ کی قیادت میں مسلمانوں نے مشرکین کا بھرپور مقابلہ کیا اور انھیں واپس مکّہ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اُحد کے میدان میں، پہلے بھی آ چکا تھا لیکن اب بھی جی چاہتا تھا کہ اس کی پتھریلی اور گرم زمین پر ننگے پاؤں اور ننگے سر پھرتا رہوں اور غزوۂ احد کو یاد کروں۔ میں جب بھی یہاں آیا اپنے آپ کو غزوۂ احد کے سپہ سالار کا ادنیٰ سا سپاہی محسوس کیا۔ مجھ کمزور سے آدمی کو اپنے اندر بجلیاں سی دوڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ ابھی سورج سر پر نہیں آیا تھا لیکن اس کے باوجود یہاں شدید گرمی تھی۔ حبشی عورتیں کپڑے، گرم مصالحے، کھلونے، کھجوریں، مصلے، تسبیحیں، ٹوپیاں، عطر اور دوسری چیزیں بیچ رہی تھیں۔

۞۞۞

خدمت گزار لوگ مدینے میں ہیں بہت

7

مکّہ مکرّمہ میں ''ہوپ'' کا باقاعدہ دفتر بنایا گیا ہے، مدینہ مَنّورہ میں ہمارے لوگ مسجدِ نبویؐ اور پاکستان ہاؤس میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہوپ نے LOST AND FOUND کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا ہے جو حاجیوں کے گم شدہ سامان کی تلاش میں مدد دیتا ہے اور بھٹک جانے والے حاجیوں کو ان کے ہوٹلوں تک پہنچاتا ہے، جدّہ اور مدینہ مَنّورہ کے ائر پورٹوں پر بھی ہم نے خدام الحجاج متعین کیے ہیں تاکہ آنے والے عازمین حج کو سرزمینِ حجاز پر اُترتے ہی آسانیوں کا احساس ہو۔

پاکستان ہاؤس

مجھے یاد تھا کہ اب مجھے جلد از جلد پاکستان ہاؤس پہنچنا ہے۔ عطاری صاحب اور یٰسین صاحب کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر مَیں سڑک پر آیا۔ ایک ٹیکسی روکی۔ ڈرائیور پاکستان ہاؤس کے بارے میں جانتا تھا۔ اس نے دس ریال میں مجھے پاکستان ہاؤس کے سامنے جا اُتارا۔

پاکستان ہاؤس کی عمارت بہت بڑی تو نہیں لیکن مناسب تھی۔ اس کی پیشانی پر جلی حروف میں پاکستان ہاؤس لکھا ہوا تھا۔ پاکستانی پرچم بھی بنا ہوا تھا۔ مرکزی دروازے سے داخل ہوا تو ہوپ کی جیکٹ پہنے ہوئے لوگ ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ بلال سامنے ہی کھڑا تھا۔ مَیں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اس جگہ پر مجھے ایک چھوٹے سے ہسپتال کا گمان ہوا۔ ایک کیبن میں سفید گاؤن پہنے، گلے میں اسٹیتھسکوپ لٹکائے ایک ڈاکٹر صاحب بیٹھے مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی دوسرا کیبن تھا جس میں بہت سی ادویات رکھی ہوئی تھیں۔ لوگ ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے نسخے کے مطابق دوائیں مفت حاصل کر رہے تھے۔ ڈاکٹر، مریض اور دیگر ملازمین سارے پاکستانی تھے۔ بلال نے بتایا کہ یہ گورنمنٹ حج میڈیکل مشن کے لوگ ہیں۔ بلال میری حیرت بھانپتے ہوئے مجھے

ایک کمرے میں لے گیا جہاں سینئر ڈاکٹر صاحبان موجود تھے۔ بلال نے ایک ڈاکٹر صاحب سے ملوایا تو بتایا کہ آپ کرنل ڈاکٹر آصف عزیز ہیں۔ حج میڈیکل مشن کے ڈائریکٹر ہیں۔ ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ آپ لیفٹیننٹ کرنل طارق محمود ہیں اور حج میڈیکل مشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔

ایک نوجوان سرجن میجر میزان جلیل بھی ملے۔ جب انھیں پتا چلا کہ میرا تعلق لکھنے لکھانے اور شعر وسخن سے ہے تو میزان جلیل بولے: ''میرے والد گرامی اسلام آباد میں ہوتے ہیں، شاعر ہیں''۔ اس سے پہلے کہ میزان اپنے والد کا نام بتاتے، مَیں بے تابی سے بولا: ''ان کا اسمِ گرامی کیا ہے؟'' بولے: ''جلیل عالی''۔ مَیں نے مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولا: ''پھر تو آپ میرے بھتیجے ہوئے''۔ میجر صاحب میری اس بے تکلفی سے کوئی غلط تاثر نہ لیں، اس لیے وہیں کھڑے کھڑے اپنے موبائل فون سے جلیل عالی صاحب کا نمبر ملا دیا۔ عالی صاحب بولے: ''مجھے فیس بک کے ذریعے سے خبر مل چکی ہے کہ آپ حج کے لیے ان دنوں سعودی عرب میں ہیں''۔ جب مَیں نے بتایا کہ مَیں اس وقت ان کے بیٹے میجر میزان جلیل کے ساتھ ہوں تو وہ بہت حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ عالی صاحب کے بارے میں کچھ مزید بتاتا چلوں کہ انھیں پچھلے سال حکومتِ پاکستان نے شاعری کا صدارتی اعزاز دیا ہے۔ ایک سرکاری کالج سے حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ اپنے دولت خانے پر ''زندہ لوگ'' کے نام سے ہر ماہ ادیبوں اور شاعروں کی محفل کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے بھائی شفیق سلیمی لاہور میں ہوتے ہیں جن کا یہ شعر زبان زدِ عام وخاص ہے:

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

مریضانِ عشق سے ملاقات

عالی صاحب نے اپنے بیٹے کو میرے بارے میں اللہ جانے کیا کہا کہ انھوں نے مجھ پر پہلے سے زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ وہ مجھے ایک وارڈ میں لے گئے جہاں پاکستانی عازمینِ حج محوِ استراحت تھے۔ کسی کو ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ کسی کو انجکشن لگایا جا رہا تھا۔ کوئی یونہی لیٹے لیٹے ہائے ہائے کر رہا تھا۔ حج مشن کے ڈائریکٹر کرنل آصف نذیر اور ڈپٹی ڈائریکٹر لیفٹیننٹ کرنل طارق محمود بھی ہمارے ساتھ تھے۔ میجر میزان جلیل نے بتایا کہ پاکستانی حکومت نے ملک بھر کے ہسپتالوں سے قرعہ اندازی کر کے تقریباً ساڑھے چار سو ڈاکٹروں اور پیرا میڈیکل سٹاف کا چناؤ کیا ہے اور یہاں عازمینِ حج کی خدمت کے لیے بھیجا ہے۔ یہ سب لوگ حج بھی کریں گے اور اللہ کے مہمانوں کی خدمت بھی۔ حج کے دنوں میں یہ سب لوگ مکّہ مکرّمہ میں عزیزیہ کے علاقے میں قائم پاکستان حج میڈیکل مشن میں کام کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ڈیڑھ سو لوگ آرمی سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی سویلین اداروں سے ہیں۔

میجر ڈاکٹر میزان جلیل چونکہ سرجن ہیں اس لیے میں نے ان سے سوال پوچھا: ''کیا آپ نے یہاں ابھی تک کوئی آپریشن کیا ہے''؟ کہنے لگے: ''یہ حج میڈیکل مشن چونکہ عارضی ہوتا ہے، اس لیے یہاں ہم مریضوں کو ادویات سے تن درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری ساری توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ جو عازمِ حج بیمار ہو کر ہمارے پاس آ گیا ہے، وہ اس قابل ہو جائے کہ حج کے مناسک سہولت کے ساتھ ادا کر سکے اور بخیر وخوبی وطن واپس لوٹ جائے۔ البتہ معمولی آپریشن کرنا پڑ جاتے ہیں۔ مریضوں کو دینے کے لیے دوائیں ہم پاکستان سے

اپنے ساتھ لاتے ہیں اور مہنگی سے مہنگی دوا بھی ہر حاجی کو مفت دی جاتی ہے۔ علاج اور دواؤں کی تقسیم میں ہم قطعاً یہ فرق روا نہیں رکھتے کہ کون سرکاری سکیم کا حاجی ہے اور کون پرائیویٹ سکیم کا''۔

پرائیویٹ اور سرکاری حاجی

سابق ڈائریکٹر جنرل حج سید فروغ آفتاب زیدی سے بھی میری ملاقات یہیں ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد حج آرگنائزرز ایسوسی ایشن آف پاکستان (H.O.A.P) نے ان کی خدمات حاصل کی ہیں۔ ہوپ کی طرف سے پرائیویٹ سکیم کے عازمینِ حج کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے قائم کیے گئے مرکز کے وہ انچارج تھے اور وزارتِ مذہبی امور پاکستان کے سابق ڈپٹی سیکرٹری علی اکبر شیخ ان کی معاونت کر رہے تھے۔ زیدی صاحب ایک نستعلیق آدمی ہیں، کوثر و تسنیم میں دُھلی اردو بولتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے پاکستانیوں کو صرف سرکاری سکیم کے تحت حج پر بھیجا جاتا تھا لیکن 2004ء میں وزارتِ مذہبی امور نے ''ہوپ'' کی مشاورت سے پرائیویٹ حج اور عمرہ ٹریول ایجنسیوں کی مشاورت سے پرائیویٹ حج سکیم تیار کی جس کے تحت پچاس فی صد عازمین حج پرائیویٹ ٹور آپریٹرز کے ذریعے سے بھجوائے جاتے ہیں اور پچاس فی صد سرکاری سکیم کے تحت۔ یہ فیصلہ سعودی حکومت کی ہدایت پر کیا گیا تھا۔ سعودی حکومت عازمین حج کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کے لیے مقابلے کی فضا قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ عازمین حج کو انتخاب کا حق مل گیا۔ اب اُنھیں جدھر زیادہ سہولت دکھائی دیتی ہے، وہ ادھر ہی جاتے ہیں۔

حج آرگنائزرز نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ''ہوپ'' کے نام سے ادارہ

قائم کرلیا جس میں تمام صوبوں اور آزاد جموں و کشمیر کے حج آرگنائزرز شامل ہیں۔ مرکزی اور صوبائی عہدیداروں کے باقاعدہ انتخابات ہوتے ہیں۔ پچھلے برس ہم نے پرائیویٹ عازمین حج کی راہ نمائی اور خدمت کے لیے تیس خدام الحجاج ''ہوپ'' کے خرچ پر سعودی عرب بھیجے تھے۔ اس سال ہم نے 81 لوگ خدمت کے لیے منتخب کیے ہیں۔ مکّہ مکرّمہ میں ''ہوپ'' کا باقاعدہ دفتر بنایا گیا ہے، مدینہ منّورہ میں ہمارے لوگ مسجدِ نبویؐ اور پاکستان ہاؤس میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہوپ نے LOST AND FOUND کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا ہے جو حاجیوں کے گم شدہ سامان کی تلاش میں مدد دیتا ہے اور بھٹک جانے والے حاجیوں کو ان کے ہوٹلوں تک پہنچاتا ہے، جدّہ اور مدینہ منّورہ کے ائر پورٹوں پر بھی ہم نے خدام الحجاج متعین کیے ہیں تاکہ آنے والے عازمین حج کو سرزمینِ حجاز پر اُترتے ہی آسانیوں کا احساس ہو۔ ہمارے لوگ انھیں ہرگز محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ کسی اجنبی سرزمین پر آ گئے ہیں۔ بڑھاپے میں نوجوانوں کی طرح کام کرنے والے علی اکبر شیخ ''ہوپ'' کے مرکزی کنٹرول روم میں بیٹھتے ہیں اور انٹرنیٹ کے ذریعے تمام خدام الحجاج سے رابطے میں رہتے ہیں۔

لنگر کا کھانا

پاکستان ہاؤس سے نکلا تو لوگوں سے پوچھتے پچھاتے مسجدِ نبویؐ میں آ گیا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ مغرب تک مسجد ہی میں رہا۔ نمازیں بھی پڑھیں اور قاری صاحب کے سامنے دوزانو بیٹھ کر قرآن پاک بھی پڑھا۔ میرے خیال میں مسجدِ نبویؐ میں قرآن پاک پڑھانے والے قاری صاحبان دراصل اہل زبان ہیں۔ اگر آپ قرآن درست تلفظ کے ساتھ پڑھنا چاہتے ہیں تو ان کے سامنے زانوئے

تلمند تہ کر لیجیے۔ ہمارے ساتھی ناصر اکبر کی ڈیوٹی مسجد نبویؐ میں تھی۔ وہ مجھے دوپہر ہی کو مل گئے تھے۔ وہ کھانا کھانے کے لیے کسی ساتھی کی تلاش میں تھے۔ سعودی عرب میں ایک کھانا، دو آدمیوں کے لیے کافی ہوتا ہے اس لیے پاکستانی کوشش کرتے ہیں کہ دو آدمی مل کر کھانا کھائیں تاکہ بچت ہو سکے۔ شام کو مسجدِ نبویؐ کے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لنگر کھایا۔ نہایت مزے دار کھانا تھا۔ چھوٹا گوشت اور دال تھی۔ ساتھ تِلوں والے گرما گرم خستہ نان تھے۔ یہ لنگر کس کی طرف سے تھا؟ پہلے کبھی پتا چلا نہ اب کے پتا چلا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے ہوٹل کی راہ لی:

تیری تقسیم کا انداز عجب ہے مولا
وہ بھی پاتا ہے جو بے نام ونسب ہے مولا

❁❁❁

تو سمجھ یہ بھی مرا حسنِ طلب ہے مولا

8

میرے گڑگڑانے کا یہ اثر ہُوا کہ میرا سینہ روشن ہو گیا۔ میرا دل آئینے کی طرح شفاف ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے مکّہ مکرّمہ کے ہوٹل میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی تھی۔ ہر میسّر چیز کو ٹھوکر ماری تھی اس لیے اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہے۔ چنانچہ اسی وقت سجدے میں گر گیا۔ رو رو کر معافی مانگی اور حج کے لیے پاسپورٹ جمع کرا دیا۔ معافی قبول ہوئی۔ ویزا لگ گیا۔ اب میں اللہ کے گھر کے قریب ہوں۔ اللہ کے قریب ہوں۔

ناشکری کا انجام

اگلے روز میرے میزبان طالب حسین صاحب میرے کمرے میں آئے تو کمرے کی حالتِ زار دیکھ کر مجھے ٹٹولنے کے لیے بولے: ''کیوں جناب! یہاں کوئی پریشانی تو نہیں آپ کو''؟ میں نے جب ان کی توقع کے مطابق جواب نہ دیا اور اپنے آپ کو مطمئن ظاہر کیا (حقیقت یہ ہے کہ میں مطمئن تھا بھی) تو انھوں نے ایک واقعہ سنایا۔ بولے: ''یہ چند سال پرانی بات ہے۔ میں حجاج کرام کے ایک قافلے کے ساتھ مکّہ مکرّمہ میں تھا۔ ایک صاحب ایک بہت بڑے اور مہنگے ہوٹل کے برآمدے میں زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی اٹھ بیٹھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اس آدمی پر ترس آ رہا تھا کہ وہ دوسرے حجاج کرام کے برعکس قدرے گرم فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ شکل سے بھی غریب لگتا تھا۔ اس کے پاس شائد ہوٹل کا کرایہ نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں فرش پر کیوں لیٹے ہوئے ہو؟ کیا ہوٹل کا کمرا نہیں مل سکا؟ بولا: ''اسی ہوٹل میں میرا کمرا بُک ہے جس میں دنیا کی ہر آسائش میسّر ہے۔ میں اپنی مرضی سے فرش پر لیٹا ہُوا ہوں''۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو بولا: ''میں پاکستانی ہوں لیکن برس ہا برس سے لندن میں مقیم ہوں۔ آج سے دس سال پہلے میں عمرے کے لیے یہاں آیا تو مجھے حرم سے دور ایک نہایت خراب و خستہ حال ہوٹل کا کمرا دیا گیا۔ میں جب

اپنے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہُوا تو ہر چیز میرے معیار سے کم تر تھی سو میں ہر چیز کو ٹانگیں مار مار کر اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ بیڈ کی چادریں میلی تھیں۔ وہ میں نے اتار کر پھینک دیں۔ کمرے میں موجود ٹوٹی پھوٹی کرسی کو میں نے زور سے زمین پر دے مارا تو وہ مکمل طور پر ٹوٹ گئی۔ ونڈو اے سی دیکھ کر بھی مجھے غصہ آ رہا تھا۔ کُولنگ کم کرتا تھا اور شور زیادہ۔ خیر میں جیسے تیسے اسی کمرے میں اپنا وقت گزار کر لندن چلا گیا۔ اُسی برس میں نے حج کا تہیہ کیا۔ ویزے کے لیے پاسپورٹ جمع کرا دیا۔ لیکن بدقسمتی سے میرا ویزا نہیں لگا۔ اگلے سال بھی کوشش کی لیکن ویزا نہیں لگا۔ آٹھ نو سال مسلسل درخواست دیتا رہا لیکن ہر بار میری درخواست مسترد ہو جاتی۔ میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر پوچھتا کہ مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے؟ مجھے اپنے گھر آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟ میرے گڑگڑانے کا یہ اثر ہُوا کہ میرا سینہ روشن ہو گیا۔ میرا دل آئینے کی طرح شفاف ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے مکّہ مکرّمہ کے ہوٹل میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی تھی۔ ہر میسّر چیز کو ٹھوکر ماری تھی اس لیے اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہے۔ چنانچہ اسی وقت سجدے میں گر گیا۔ رو رو کر معافی مانگی اور حج کے لیے پاسپورٹ جمع کرا دیا۔ معافی قبول ہوئی۔ ویزا لگ گیا۔ اب میں اللہ کے گھر کے قریب ہوں۔ اللہ کے قریب ہوں۔ سب کچھ میسّر ہے لیکن یہ فرش مجھے اچھا لگتا ہے۔ میرے کمرے میں اے سی لگا ہوا ہے۔ بہترین بیڈ ہے۔ نہایت عمدہ کھانا میسّر ہے لیکن مجھے یہاں زمین پر سونا پسند ہے۔ ڈرتا ہوں کہ میرا اللہ کہیں پھر مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ کھانا بھی مانگ کر کھاتا ہوں۔ یہاں پڑا رہتا ہوں۔ لوگ میرے سامنے کھانا رکھ جاتے ہیں۔ میں صبر شکر کر کے کھا لیتا ہوں۔ بندگی کا لطف اب آیا ہے اب الحمدللہ میں کسی موقع پر ناشکری نہیں کرتا۔ ذرا سی مہربانی کرنے والوں کا

شکر یہ بھی ادا کرتا ہوں اور دنیا جہان کی نعمتیں دینے والے خالق اور رازق کا بھی شکر ادا کرتا ہوں۔ ہر حال میں خوش رہتا ہوں۔ خوشی باہر نہیں ہوتی آپ کے اندر ہوتی ہے۔ جس نے یہ راز پالیا۔ اس نے عمر بھر کا اطمینان پا لیا‘‘۔

میں جو دن رات ترا شکر ادا کرتا ہوں
تو سمجھ یہ بھی مرا حسنِ طلب ہے مولا

چھوٹی سی نیکی

طالب حسین صاحب کے جانے کے بعد دل آپ ہی آپ مسجدِ نبویؐ کی طرف جانے کو مچلا۔ سو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جنّت البقیع کے بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ پیاس لگی تو میں نے اپنے بیگ سے آبِ زم زم سے بھری ہوئی ہاف لیٹر کی بوتل نکالی۔ ابھی منہ سے لگائی ہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تیزی سے میرے قریب آئی۔ اس نے اشارے سے پانی مانگا۔ میں نے کہا: ’’ایک ہی بوتل ہے اور وہ بھی میں نے منہ سے لگا لی ہے‘‘۔ بولی: ’’کوئی بات نہیں۔ میں پی لوں گی‘‘۔ میں نے بوتل اس کے حوالے کر دی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ یہ آبِ زم زم ہے تو اس کی خوشی دو چند ہوگئی۔ یہ مفت کی نیکی تھی لیکن اسے میں دریا میں نہیں ڈال سکا۔ یہاں یہ سوچ کر لکھ رہا ہوں کہ آپ کو بھی اگر عمرے یا حج پر جانے کی سعادت حاصل ہو تو اس طرح چھوٹی چھوٹی نیکیاں ضرور کیجیے گا۔ کئی لوگوں کو میں نے دیکھا کہ ان کے پاس آبِ زم زم موجود ہوتا ہے اور ان سے کوئی مانگ لے تو یہ کہہ کر دینے سے انکار کر دیتے ہیں کہ ہم نے بہت محنت سے بوتلیں بھری ہیں۔ اب سعودی حکومت نے تمام ہوٹلوں کو پابند کر رکھا ہے کہ عمرے کے دنوں میں بالعموم اور حج کے دنوں میں بالخصوص اللہ کے مہمانوں کے لیے آبِ زم

زم فراہم کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کے لیے آبِ زم زم اتنی فراوانی سے فراہم کیا ہے تو ہم تھُڑ دلی کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں؟

ہندوستانی عرب نوجوان

وقت چونکہ صبح کا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ ابھی مسجد نبویؐ کے باہر ہی گھومتا ہوں۔ ایک جگہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا تو میں بھی اس طرف چل دیا۔ پتا چلا کہ یہ ایک عجائب خانہ ہے جس میں قرآن پاک کے قدیم اور کم یاب نسخے رکھے گئے ہیں۔ اس عجائب خانے میں داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں تھا سو میں بھی اندر چلا گیا۔ قرآنِ پاک کے بڑے بڑے نسخے شیشے کے شوکیسوں میں موجود تھے۔ عربی لباس پہنے ہوئے ایک نوجوان قرآن پاک کے ہر نسخے کے بارے میں اردو زبان میں معلومات دے رہا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی حیران تھا کہ ایک عربی کس طرح اتنی شستہ اور بامحاورہ اردو بول سکتا ہے؟ ایک بہت بڑے قرآن پاک کے پاس پہنچ کر اس عرب نوجوان نے بتایا کہ یہ نسخہ اتنا وزنی ہے کہ مکمل ہونے کے بعد اسے چار اونٹوں پر نہایت ادب اور احترام کے ساتھ رکھ کر خلیفہء وقت کے دربار میں لایا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ قرآنِ پاک کے جتنے بھی قدیم اور کم یاب نسخے تھے، ان میں سے کسی پر بھی اعراب نہیں لگے ہوئے تھے۔ جب عرب نوجوان تمام نسخوں کا تعارف کروا چکا تو لوگ خارجی دروازے سے باہر جانے لگے۔ میں وہیں رُک گیا۔ مجھے اس نوجوان نے باہر جانے کو کہا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ لاہور سے آیا ہوں۔ لکھنے لکھانے سے شغف رکھتا ہوں اور ایک کالج میں استاد ہوں تو اس نے مجھے روک لیا۔ میں نے اس سے پوچھا: ’’آپ نے اتنی اچھی اردو کہاں سے سیکھی؟‘‘ تو بولا: ’’آپ

سے کس نے کہا کہ میں عرب ہوں میرے بھائی! میں ہندوستانی ہوں۔ کان پور کا رہنے والا ہوں۔ بس میرا لباس عربوں کا سا ہے''۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس عجائب خانے میں کئی برس سے ملازمت کررہا ہے لیکن آج تک اس نے کسی کو اپنے ہندوستانی ہونے کے بارے میں نہیں بتایا۔

نیّت کا مارا

عجائب خانے سے باہر نکلا تو سامنے کھجور مارکیٹ دکھائی دی۔ سو تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے لیے اُدھر چل پڑا۔ مارکیٹ سے پہلے دکانوں کی ایک لمبی قطار ہے۔ ان دکانوں پر مختلف قسم کے عطر اور خوشبوئیں فروخت ہوتی ہیں۔ دکان دار چونکہ پاکستانی اور انڈین ہیں اس لیے ہر چیز کا ریٹ گاہک کی ظاہری حالت دیکھ کر بتاتے ہیں۔ ان دکانوں پر روغنِ بلسان بھی فروخت ہوتا ہے۔ یہ ایک کم یاب پودے سے نکلنے والا عرق ہے جو زخموں پر لگایا جائے تو زخم مندمل ہوجاتے ہیں۔ دودھ میں ملا کر پیا جائے تو جوڑوں کا درد ختم ہو جاتا ہے۔ جوڑوں کے اوپر اس کی مالش بھی کی جاتی ہے۔ مدینہ مَنّورہ آنے والے اکثر لوگ روغنِ بلسان ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ میں نے پچھلی بار اسی دکان سے روغنِ بلسان کی دو شیشیاں بیس بیس ریال میں خریدی تھیں۔ ایک صاحب جو شکل اور لباس سے نہایت معزّز اور مال دار دکھائی دیتے تھے۔ دکان سے روغنِ بلسان خریدنا چاہتے تھے۔ دکان دار نے وہی شیشی اس آدمی کو دکھائی جو میں نے اس سے بیس ریال میں خریدی تھی۔ گاہک نے ریٹ پوچھا تو دکان دار بہت سنجیدگی سے بولا: ''پانچ سو ریال''۔ اس کا مطلب تھا پاکستانی 14 ہزار روپے۔ تھوڑے سے بھاؤ تاؤ کے بعد ان صاحب نے روغنِ بلسان کی وہ شیشی تین سو ریال میں خرید لی۔

دکان دار پاکستانی تھا یا انڈین لیکن اس نے نہایت چالاکی سے نبیؐ کے شہر میں عقیدت کی دولت لے کر آنے والے کو لوٹ لیا تھا۔ دکان دار کے دل میں ذرا سا بھی خیال نہیں آیا کہ اس کی نظروں کے سامنے مسجد نبویؐ ہے اور مسجدِ نبویؐ میں روضہء رسولؐ ہے۔ اس رسولؐ کا روضہ جس نے دنیا بھر کے تاجروں کو تجارت کے اصول سکھائے تھے۔ مال میں نقص تھا تو گاہک کو پہلے ہی آگاہ کردیا۔ جس شے کی جتنی قیمت بنتی تھی، اتنی ہی مانگی، ایک درہم بھی زیادہ نہ لیا۔

دکان دار نے اتنی بے دردی سے گاہک کو لُوٹا تھا کہ میں وہیں سے واپس ہو لیا۔ مسجد نبویؐ کے اندر داخل ہونے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ دکان دار کے جرم میں، میں بھی برابر کا شریک ہوں۔ مجھے اس خریدار کو خبردار کردینا چاہیے تھا کہ اسے لوٹنے کی کوشش ہورہی ہے۔ میں وہیں فٹ پاتھ پر ڈھیر ہوگیا۔ مجھے منیر نیازی کی نظم کی یہ لائنیں یاد آرہی تھیں:

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں
ضروری بات کہنی ہو، کوئی وعدہ نبھانا ہو
اسے آواز دینی ہو، اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں
کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ اس کو جا کے یہ بتانا ہو
ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں

بھر دو جھولی مری یا محمدؐ

مجھے اپنا آپ خالی خالی لگنے لگا۔ سب کچھ میسّر ہونے کے باوجود ہماری نیّت

کیوں نہیں بھرتی؟ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بیگ سے اپنا موبائل فون نکالا، ہیڈ فون لگایا اور یوٹیوب پر پُرنم الٰہ آبادی کی لکھی ہوئی قوالی بھر دو جھولی تلاش کرنے لگا۔ غلام فریدی صابری اور مقبول صابری کی آواز نے عجب جادو جگایا

بھر دو جھولی مری یا محمدؐ
لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی
کچھ نواسوں کا صدقہ عطا ہو
در پہ آیا ہوں بن کر سوالی

یہ قوالی میں لاہور میں بھی سنتا تھا لیکن یہاں سُنی تو یوں لگا کہ یہ پُرنم الٰہ آبادی نے نہیں، میں نے ابھی ابھی لکھی ہے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ قوالی میں اکیلا نہیں سن رہا، وہ بھی سن رہے ہیں جن کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔ جب صابری برادران نے کہا:

آ رہے ہیں وہ دیکھو محمدؐ
جن کے کاندھے پہ کملی ہے کالی

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری چشمِ حیراں کسی کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں کالی کملی والے کی شان میں گستاخی نہ ہو جائے۔ جب صابری برادران نے کہا:

کاش پُرنم دیارِ نبیؐ میں
جیتے جی ہو بلاوا کسی دن
حالِ غم مصطفیٰؐ کو سناؤں
تھام کر انؐ کے روضے کی جالی

تو میں نے موبائل آف کیا اور ساتھ والے دروازے سے مسجدِ نبویؐ کے صحن میں داخل ہو گیا۔

مدینے سے مکّے کی جانب چلا ہوں

9

بس کلاک ٹاور کے قریب پہنچی تو اسے دیکھ کر عطاری صاحب بولے: ''چلیے صاحب دعا مانگ لیجیے کلاک ٹاور آ گیا ہے''۔
میں نے کہا: ''یہ کلاک ٹاور ایک کمرشل عمارت ہے۔ اس کے اندر عمرے اور حج کے لیے آنے والوں کی نہایت بے رحمی سے کھال اتاری جاتی ہے''۔
میری بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انھوں نے جلدی سے ہاتھ نیچے گرا دیے اور تلبیہ پکارنا شروع کر دیا۔

الوداع! مدینہ منوّرہ

6 ستمبر کو ذوالحجہ کی چار تاریخ تھی۔ اگلے روز یعنی سات ستمبر کو مکّہ مکرّمہ روانہ ہونا تھا اس لیے کمرے میں موجود تمام لوگ اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ مدینہ منّورہ میں کھجور سستی اور عمدہ ہوتی ہے اس لیے سب نے اپنی اپنی استطاعت، پسند اور ضرورت کے مطابق کھجوریں خرید لی تھیں۔ ابھی ہماری پاکستان واپسی میں ایک ماہ باقی تھا۔ ہمارے ایک ساتھی نے کھجور کی دو پیٹیاں خریدی تھیں۔ میں حیران تھا کہ وہ انھیں پاکستان کِس طرح لے جائیں گے۔لیکن ان کے چہرے پر پریشانی کے ذرا سے بھی آثار نہ تھے۔ انھوں نے مدینہ منّورہ کی کھجور مارکیٹ کے قریب واقع ایک کارگوسروس سے اپنی دونوں پیٹیاں لاہور بلٹی کروا دیں۔ دوتین سو ریال لگ گئے لیکن ان کا بوجھ کم ہو گیا۔ ان کی حکمت عملی سب سے بہتر رہی۔ بعد میں انھوں نے بتایا کہ ان کی کھجوریں ایک ہفتے کے اندر اندر لاہور پہنچ گئی تھیں۔

ہم مدینہ منّورہ کی پُرنور فضاؤں میں گم ہو کر بھول چکے تھے کہ ہم حج کے لیے آئے ہیں۔ اب جب ہمارے گروپ لیڈر نے بتایا کہ کل مکّہ مکرّمہ روانگی ہے تو ہم نے وہ سب سامان الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا جو ہم لاہور سے حج کے لیے

اپنے ساتھ لائے تھے۔

حج کی اقسام

حج کی تین اقسام ہوتی ہیں۔

(الف) حجِ قِران

(ب) حجِ تمتّع

(ج) حجِ افراد

حجِ قران کرنے والا حاجی، قارِن کہلاتا ہے۔ اس میں عمرے اور حج کا ایک ہی احرام باندھا جاتا ہے۔ عمرہ کرنے کے بعد قارن حلق یا قصر نہیں کروا سکتا۔ اسے بدستور اسی احرام میں رہنا ہوتا ہے۔ البتہ قربانی کے بعد حلق یا قصر کروا کے احرام کھول سکتا ہے۔

حجِ تمتّع صرف میقات سے باہر والے ہی ادا کر سکتے ہیں۔ اس میں حاجی عمرہ ادا کرنے اور حلق و قصر کرنے کے بعد احرام کھول سکتے ہیں۔ ایامِ حج یعنی آٹھ ذوالحجہ کو دوبارہ احرام پہن لیتے ہیں۔ جو یہ حج کرے وہ حاجی متمتّع کہلاتا ہے۔

حجِ افراد میں عمرہ شامل نہیں ہے۔ صرف حج کا احرام باندھا جاتا ہے۔ اہلِ مکّہ اور حل یعنی میقات اور حدودِ حرم کے درمیان رہنے والے باشندے حجِ افراد کر سکتے ہیں۔ حجِ افراد کرنے والے حاجی کو مفرد کہتے ہیں۔

پاکستان سے جانے والے تمام افراد حجِ تمتع کرتے ہیں۔ عمرہ کرتے ہیں اور حلق یا قصر کے بعد احرام کھول دیتے ہیں۔ آٹھ ذوالحجہ کو دوبارہ احرام باندھ لیتے ہیں۔ اس میں حاجی کو آسانی یہ ہوتی ہے کہ عمرہ ادا کرنے کے بعد وہ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ جبکہ حج قران میں ایک ہی احرام میں عمرہ اور حج

کرنا ہوتا ہے۔ احرام کی پابندیاں چونکہ بہت زیادہ ہیں اس لیے زیادہ تر لوگ حجِ قران کے بجائے حجِ تمتع ہی کرتے ہیں۔

عمروعیار کی زنبیل

ہمارے گروپ لیڈر نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آپ کو حجِ تمتّع کرنا ہے۔ چنانچہ ہم سب اپنے ساتھ دو دو احرام لائے تھے۔ بلکہ میرے پاس تو تین احرام تھے۔ صُفہ ٹریولز والے حاجی احسان اللہ صاحب نے مجھے پہیوں والا ایک بریف کیس عنایت کیا تھا۔ گھر آ کر یہ بریف کیس کھولا تو عمروعیار کی زنبیل کی طرح مختلف چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ چھتری، پانی کی بوتل، بیلٹ، ہینڈ بیگ، خوشبو کے بغیر صابن اور ایک احرام۔ یہاں اگر میں اپنے بہت اچھے دوست سید عظمت کا ذکر نہ کروں تو شاید ناانصافی بھی ہوگی اور ناشکری بھی۔ ایک برس پہلے جب میں اپنی بیگم کے ساتھ عمرے پر روانہ ہُوا تو انھوں نے بھی مجھے اسی طرح کی ایک زنبیل عطا کی تھی۔ حج کا بُلاوا آیا تو سید عظمت مزید پُرجوش ہو گئے اور بولے: ''اس دفعہ بھی سامانِ سفر میری جانب سے قبول کیجیے گا اور میرے حق میں دعا کیجیے گا''۔

سید عظمت کا تعارف یہ ہے کہ لاہور کے پرانے علاقے کرشن نگر میں رہتے ہیں۔ کاروباری آدمی ہیں۔ شعر و ادب کے رسیا ہیں۔ کتاب دوست ہیں۔ مسلم لیگ نون کے سرکردہ رہنما ہیں۔ خود سیاست میں حصہ نہیں لیتے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے تعاون، راہ نمائی اور سرپرستی کے بغیر کرشن نگر سے کوئی شخص الیکشن جیت ہی نہیں سکتا۔ مغلوں کے دور میں سیّد برادران کا بہت چرچا رہا ہے جو بادشاہوں اور شہزادوں کو انگلیوں پر نچاتے تھے۔ جسے چاہتے تخت پر بٹھا دیتے، جسے چاہتے معزول کروا دیتے۔ سید عظمت اپنے علاقے کے بادشاہ گر ہیں۔

میں نے جب اپنا بریف کیس کھولا تو اس میں موجود سامان دیکھتے ہی مجھے حاجی احسان اللہ اور سید عظمت یاد آنے لگے۔ دونوں کے لیے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ اسی سامان میں مجھے اپنے ٹیلی فونک دوست ڈاکٹر خالد محمود کی طرف سے ملنے والی چھوٹی سی کتاب ''ترتیبِ حج'' بھی دکھائی دی جس میں نہایت آسان اور سادہ زبان میں مناسکِ حج کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر ریاض الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے۔

شام کو ہم سب دوست اپنے کمرے میں جمع ہوئے تو اسحاق عطاری صاحب نے ہمیں حج اور مناسکِ حج کے بارے میں لیکچر دینا شروع کر دیا۔ گویا وہ ہمارے رہبر و رہنما بن گئے تھے۔ گروپ لیڈر شکیل بھی اب ان کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھے ہوئے تھے۔

حج کی اجازت مل گئی

مدینہ مَنّورہ میں یہ آخری رات تھی۔ سو عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد بھی میں دیر تک مسجد نبویؐ ہی میں موجود رہا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ میں ابھی تک ریاض الجنّۃ میں داخل نہیں ہو سکا تھا لیکن اس رات مجھ پر مدینے والے کا کرم ہو گیا۔ ریاض الجنّۃ میں نہایت آسانی سے جگہ مل گئی۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے مدینے والے نے مجھے حج کی اجازت دے دی تھی۔

7 ستمبر کو صبح سویرے ہی ہم سب مکّہ مکّرمہ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ایک احرام الگ سے رکھ لیا تھا۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہمارے میزبان ہمیں کبابش ریسٹورنٹ لے گئے۔ نہایت لذیذ کھانا کھانے کے بعد ہم ایک بار پھر اپنے ہوٹل میں آ گئے۔ عطاری صاحب کے مشورے پر ہم سب نے ہوٹل ہی میں

احرام باندھ لیا۔انھوں نے بتایا کہ احرام باندھتے ہی احرام کی پابندیاں لاگو نہیں ہو جاتیں۔ یہ پابندیاں میقات یعنی مسجد ذوالحلیفہ میں عمرے کی نیّت اور دو نفل ادا کرنے کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہُوا کہ ہم نے اپنے اتارے ہوئے کپڑے بھی اپنے سامان میں پیک کر دیے۔ چار بجے ہمیں لے جانے کے لیے بس آ گئی۔ چند منٹوں میں بس مسجد ذوالحلیفہ پہنچ گئی۔ یہاں ہر طرف عازمینِ حج دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو سیدھے مدینہ مَنّورہ پہنچے تھے۔ بیش تر حج تمتّع کرنے والے لوگ تھے۔ممکن ہے کہ کچھ لوگ حج قِران کرنے والے بھی ہوں۔ ہم سب نے احرام کی نیّت سے دو دو نفل ادا کیے۔ اور تلبیہ پکارتے ہوئے بس میں سوار ہو گئے:

”میں حاضر ہوں۔ اے اللہ میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں تیرے ہی لیے ہیں اور ملک بھی۔ تیرا کوئی شریک نہیں“۔

عطاری صاحب تلبیہ پکارتے ہم ان کے پیچھے پیچھے پڑھتے جاتے۔بس میں عجیب روح پرور منظر تھا۔سفید احرام میں لپٹا ہوا ہر آدمی فرشتہ دکھائی دے رہا تھا۔ بس صاف شفاف پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ایک چیک پوسٹ پر بس رُکی تو باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈرائیور نے آٹو کنٹرول سے دروازہ کھول دیا۔ ایک شخص تیزی سے بس میں داخل ہُوا اور چالیس پچاس لنچ بکس خالی جگہ پر رکھ دیے۔ہم اللہ کے مہمان تھے۔ میزبان نے خود ہی کھانا بھیج دیا تھا۔اس سفر کے دوران میں ہمیں کئی بار پولیس اہل کاروں نے چیک کیا۔ میرے پوچھنے پر ایک ساتھی نے بتایا کہ سعودی عرب میں ملازمت اور کاروبار کرنے والے بہت سے لوگ سعودی حکومت سے اجازت لیے بغیر حج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ

پولیس والے انھیں روکتے ہیں اور یہیں سے واپس گھر بھیج دیتے ہیں۔سعودی عرب میں مقیم لوگوں کو حج کرنے کی اجازت مشروط طور پر ملتی ہے۔سعودی حکومت نے اس کے لیے کچھ فیس مقرر کر رکھی ہے۔ وہ ادا کیجیے اور حج کر لیجیے۔ اس پابندی کا فائدہ دوسرے ملکوں سے آنے والے ہم جیسے حاجیوں کو ہوتا ہے۔ہم آسانی سے حج کر پاتے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا زیادہ فائدہ سعودی حکومت ہی اٹھاتی ہے۔اس کی آمدن میں بے بہا اضافہ ہو رہا ہے۔

بس مکّہ مکرّمہ میں داخل ہوئی تو رات گہری ہو چکی تھی لیکن روشنیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ سارا شہر بُقعہء نور بنا ہُوا تھا۔ کلاک ٹاور بھی دکھائی دے رہا تھا۔لیکن یہ ابھی کچھ دور تھا۔بس کلاک ٹاور کے قریب پہنچی تو اسے دیکھ کر عطاری صاحب بولے:”چلیے صاحب دعا مانگ لیجیے کلاک ٹاور آ گیا ہے“۔

میں نے کہا:”یہ کلاک ٹاور ایک کمرشل عمارت ہے۔ اس کے اندر عمرے اور حج کے لیے آنے والوں کی نہایت بے رحمی سے کھال اتاری جاتی ہے“۔

میری بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔انھوں نے جلدی سے ہاتھ نیچے گرا دیے اور تلبیہ پکارنا شروع کر دیا۔

طواف گاہِ حرم نے پھر سے بُلا لیا ہے

0

ہم چاروں نظریں جھکائے ہوئے مسجد الحرام میں داخل ہوئے۔ دِل ہی دِل میں مسجد میں داخل ہونے کی دُعا پڑھی۔ چند قدم چلنے کے بعد ہمارے رہبر و راہ نما ناصر اکبر صاحب اچانک رُک گئے۔ ہم سب بھی رُک گئے۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو سامنے اللہ تعالیٰ کا گھر تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ پورے جسم میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ یوں لگا جیسے برسوں کا بچھڑا کوئی ساتھی مل گیا ہے۔ جی چاہا کہ تیزی سے آگے بڑھ کر بانہوں میں سمیٹ لوں۔

عزیزیہ کے ساتھی

بس نے ہم سب کو عزیزیہ کی ایک چھوٹی کی عمارت کے سامنے جا اُتارا۔ عزیزیہ مسجد الحرام سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک علاقہ ہے۔ پاکستانی عازمینِ حج کو عام طور پر یہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہاں چونکہ عمارتیں نسبتاً سستی مل جاتی ہیں اِس لیے سرکاری سکیم کے عازمین حج کو وزارتِ مذہبی امور یہیں ٹھہراتی ہے۔ ہر نماز سے آدھا گھنٹا پہلے یہاں سے لاتعداد بسیں چلتی ہیں جو عازمینِ حج کو خانہ کعبہ لے کر جاتی ہیں۔ اِن بسوں کا کرایہ ہماری وزارتِ مذہبی امور ادا کرتی ہے۔ کھانا بھی اِسی ہوٹل میں مفت فراہم کیا جاتا ہے، جس میں عازمینِ حج کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ سرکاری سکیم کے حاجیوں کا کھانا مناسب ہوتا ہے، لیکن پرائیویٹ سکیم کے حاجیوں سے چونکہ نسبتاً زیادہ پیسے وصول کیے جاتے ہیں اِس لیے کھانا بھی بہترین دیا جاتا ہے۔

ہمیں جس عمارت میں لے جایا گیا تھا یہ ہوٹل تو نہیں تھا، لیکن اسے دیکھ کر ایک چھوٹے سے گیسٹ ہاؤس کا گمان گزرتا تھا۔ ایک کمرے میں سات سات بیڈ بچھائے گئے تھے۔ مجھے ایک چھوٹا کمرہ مل گیا تھا، جس میں صرف تین بیڈ بچھے ہوئے تھے۔ ایک بیڈ سعید سکندر نے سنبھال لیا اور دوسرا سعد شیخ نے۔ سعد شیخ ایک تیز طرار اور شوخ نوجوان تھا۔ اُس کی والدہ چونکہ خود ایک سرکاری کالج میں

پروفیسر اور بعد میں پرنسپل رہی ہیں اِس لیے اُس نے مجھے اُتنا ہی اہم سمجھا جتنا ایک پرنسپل گریڈ 18 کے ایک اسسٹنٹ پروفیسر کو سمجھتا ہے۔وہ مجھے دانستہ نظر انداز کر رہا تھا۔مَیں نے اس کے اِس رویے کو اس کی ناتجربہ کاری پر محمول کیا اس لیے مَیں نے اُسے تو نظر انداز نہیں کیا۔ البتہ اس کے رویے سے ضرور چشم پوشی کی۔مجھے یقین تھا کہ جب اُسے میری شخصیت سے آگاہی ہو گی تو اُس کا رویّہ خود ہی بدل جائے گا۔اور بعد میں ایسا ہُوا بھی۔ یہ نوجوان سراپا محبت و احترام ثابت ہُوا۔سعید سکندر بھی ایک مشکل آدمی تھا۔اس کی شخصیت کچھ الجھی ہوئی سی تھی۔وہ بات بات پر دوستوں سے بگڑ جاتا تھا۔شاید بلڈ پریشر کا مریض تھا۔کچھ وقت کے بعد ہم تینوں دوسرے کمرے میں گئے اور دھیمے مزاج کے نہایت ٹھنڈے آدمی ناصر اکبر کو ساتھ لیا اور ہوٹل سے باہر آ گئے۔

کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر

ناصر اکبر چونکہ عمر میں ہم سے بڑے تھے۔وہ پہلے بھی کئی حج کر چکے ہیں اس لیے ہم نے انھیں اپنا رہبر و راہ نما تسلیم کِیا،ٹیکسی پکڑی اور مسجد الحرام کی طرف چل پڑے۔ ناصر اکبر تلبیہ پکارتے جاتے تھے اور ہم تینوں اُن کی پیروی کرتے جاتے۔آواز ہمارے دِلوں سے نکل رہی تھی۔ کہنے کو یہ عمرہ تھا لیکن اس بار یہ حج کے آغاز کے لیے تھا اس لیے میرے دِل کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خانہ کعبہ میرا نہایت بے تابی سے انتظار کر رہا ہے اور میرا دِل جلد از جلد خانہ کعبہ کے سامنے پہنچ جانے کے لیے مضطرب تھا۔جب ہم لبیک اللّٰھم لبیک کی صدائیں لگاتے،خانہ کعبہ کی طرف جا رہے تھے تب رات کے تقریباً تین بج رہے تھے،لیکن اردگرد اتنی پُرنُور اور روحانی فضا تھی کہ رات کا گمان ہی نہیں ہُوا۔لاتعداد

لوگ احرام باندھے خانہ کعبہ کی طرف پیدل ہی رواں دواں تھے۔اسی طرح بہت سے لوگ معمول کے لباس میں بیت اللہ کی طرف تیزی سے اُڑے چلے جا رہے تھے۔جب ٹیکسی والے نے ہم چاروں کو ایک جگہ اُتار دیا تو ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو خانہ کعبہ کی طرف تیزی سے اُڑے چلے جا رہے تھے۔تلبیہ کے الفاظ پیہم ہماری زبان سے ادا ہو رہے تھے۔دِل بھی زبان کا ساتھ دے رہا تھا۔ ہم چاروں نظریں جھکائے ہوئے مسجد الحرام میں داخل ہوئے۔دِل ہی دِل میں مسجد میں داخل ہونے کی دُعا پڑھی۔چند قدم چلنے کے بعد ہمارے رہبر و راہ نما ناصر اکبر صاحب اچانک رُک گئے۔ہم سب بھی رُک گئے۔آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو سامنے اللہ تعالیٰ کا گھر تھا۔ہونٹ کپکپا رہے تھے۔پورے جسم میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ یوں لگا جیسے برسوں کا بچھڑا کوئی ساتھی مل گیا ہے۔جی چاہا کہ تیزی سے آگے بڑھ کر باہنوں میں سمیٹ لوں۔میرے دِل نے تیزی سے اپنی ساری خواہشوں،آرزوؤں،تمناؤں اور حسرتوں کو دُعا کا رنگ دے دیا۔اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں،اپنی اہلیہ،چاروں بچوں،رشتے داروں اور دوست احباب کے لیے پلک جھپکنے سے پہلے مَیں نے اللہ تعالیٰ سے وہ سب کچھ مانگ لیا،جس کی انھیں طلب تھی۔

ارمغانِ حرم

مجھے اپنے یہ اشعار بھی یاد آنے لگے تھے،جو مَیں نے مدینہ مُنوّرہ سے مکّہ مکّرمہ کی طرف آتے ہوئے چپکے چپکے کہہ لیے تھے اور کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی تھی۔

طوافِ گاہِ حرم نے پھر سے بُلا لیا ہے
مرے گناہوں کا بوجھ سارا اُٹھا لیا ہے

مَیں گہری مایوسیوں کے سائے میں چل رہا تھا
مگر اچانک خدا کی رحمت نے آ لِیا ہے

مجھے بھی کعبے کو چھُونے کی مل گئی اجازت
مرے خدا نے مجھے بھی اپنا بنا لِیا ہے

مجھے ستارے بھی دیکھتے ہیں بچشمِ حیرت
کہ مَیں نے اشکوں سے اپنا دامن سجا لِیا ہے

مجھے بھی نورِ ازل سے حصہ مِلا ہے میرا
تبھی تو مَیں نے چراغ دِل کا جلا لِیا ہے

اُداس جب بھی ہُوا ہوں بچوں کو یاد کر کے
تو مَیں نے چکر خدا کے گھر کا لگا لِیا ہے

بغیر مانگے ہی مل رہا ہے تمھیں تو ناصرؔ
بتاؤ تم نے کہاں سے رنگِ دُعا لِیا ہے

مطاف ہمارے سامنے تھا۔ ہم تلبیہ پُکارتے ہوئے خانہ کعبہ کے حجرِ اسود والے کونے کی طرف بڑھے جسے رکنِ اَسود کہتے ہیں حجرِ اسود کے عین سامنے سبز رنگ کی ٹیوب لائٹس لگی ہوئی ہیں۔ سبز رنگ کی ٹیوب لائٹس سے راہ نمائی پا کر ہم عین حجرِ اسود کی سیدھ میں آ گئے۔ طواف کی نیّت کی اور احرام کی اوپر والی چادر کا پلو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لیا۔ دایاں کندھا ننگا ہو گیا۔ اس عمل کو اضطباع کہتے ہیں۔ یہ عمل صرف مَردوں کے لیے ہے۔ اِسی حالت میں خانہ کعبہ کے گرد سات چکر پورے کرنا ہوتے ہیں۔ اضطباع کے بعد دونوں ہاتھ

کانوں تک اُٹھا کر ہتھیلیاں حجرِ اسود کی جانب کیں اور بسم اللہ، اللہ اکبر وللہ الحمد کہہ کر ہاتھ نیچے گرا دیے۔ اس عمل کو استقبالِ حجرِ اسود کہتے ہیں اور یہ طواف کے آغاز میں ایک ہی دفعہ کِیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ چھاتی تک اٹھائے۔ ہتھیلیوں کا رُخ حجرِ اسود کی طرف کِیا۔ استقبالِ حجرِ اسود والے الفاظ کہہ کر دونوں ہتھیلیوں کو چوم کر نیچے گرا دیا۔ یہ عمل، استلام حجرِ اسود کہلاتا ہے۔ یہ عمل طواف کے ہر چکر کے شروع میں کرنا پڑتا ہے۔ ساتواں چکر مکمل ہونے پر بھی استلام کرنا ہوتا ہے۔ گویا طواف مکمل ہونے پر آٹھ استلام ہوں گے۔

طواف، اضطباع، رمَل اور واجب الطواف

حجرِ اسود سے شروع ہونے والا ایک چکر عین حجرِ اسود کے سامنے آ کر پورا ہوتا ہے اور دوسرا چکر شروع ہو جاتا ہے۔ ہم خانہ کعبہ اور حطیم کے قریب تھے اس لیے سات چکر جلد ہی پورے ہو گئے۔ سات چکر پورے ہوتے ہی مَیں نے اپنا دایاں ننگا کندھا احرام کی اوپر والی چادر سے ایک بار پھر ڈھانپ لیا۔ مرد پہلے تین چکروں میں رمَل کرتے ہیں، یعنی پہلوانوں کی طرح بازو ہلا ہلا کر، تھوڑا سا اکڑ کر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر چلتے ہیں۔ اگلے چار چکروں میں اپنی مرضی سے جس طرح چاہیں، چل سکتے ہیں۔ رمَل کرنا سنت ہے۔ خواتین رمَل نہیں کرتیں۔ حطیم بھی چونکہ خانہ کعبہ کا حصہ ہے اس لیے طواف کے دوران میں حطیم کے اندر سے گزرنے اور خانہ کعبہ کی طرف دیکھنے کی ممانعت ہے۔ طواف کرتے ہوئے مَیں اپنے والدین، بہن بھائیوں، اہلیہ، بچوں، رشتے داروں، دوستوں اور اپنے ملک کے لیے دُعائیں مانگتا رہا۔ ضروری نہیں کہ طواف کرتے ہوئے دُعائیں عربی زبان میں مانگی جائیں، آپ اپنی زبان میں کوئی بھی دُعا مانگ سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ طواف

کے دوران میں اگر آپ خاموش رہیں تو بھی طواف ہو جاتا ہے۔

طواف کے سات چکر پورے ہو جانے کے بعد ہم حجرِ اسود اور خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان والی جگہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔اس جگہ کو ملتزم کہا جاتا ہے۔ایک بار پھر دُعاؤں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔یہاں سے چند قدم آگے مقامِ ابراہیم ہے، جہاں ہم چاروں نے دو رکعت نماز ادا کی جسے واجب الطواف کہتے ہیں۔

عمرے کا ایک حصہ مکمل ہو چکا تھا۔پچھلے سال مَیں یہاں آیا تھا تو آبِ زم زم کے لاتعداد کولر جگہ جگہ دکھائی دیے تھے،لیکن اب یہاں سٹیل کی ٹونٹیاں لگا دی گئی ہیں۔ ڈسپوزایبل گلاس موجود تھے۔ جی بھر کے آبِ زم زم پیا۔آبِ زم زم کی برکت دیکھیے کہ ہم نے خالی پیٹ پیا اور یوں لگا جیسے ہماری بھوک ہی مِٹ گئی ہے۔

ابھی ہمیں صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سعی کرنا تھی، اس لیے آبِ زم زم پینے کے بعد ایک بار پھر حجرِ اسود کی سیدھ میں آ کر استلام کیا۔جس طواف کے بعد صفا اور مروہ کی سعی کرنا ہو اس سے پہلے بھی استلام لازم ہے۔گویا استلاموں کی تعداد نو ہو جاتی ہے۔البتہ نفلی طواف میں آٹھ استلام ہوتے ہیں۔

صفا و مروہ کی پہاڑیاں

صفا اور مروہ کی پہاڑیاں اب مسجد الحرام کے اندر ہی ہیں۔عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی دشوار گزار مقام ہو گا جہاں چلنا بہت مشکل ہوتا ہو گا۔حقیقت یہ نہیں، جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں پیاس کے مارے تڑپ رہے تھے اور حضرت حاجرہ پانی کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھیں تب یہ واقعی دشوار گزار مقام تھا،لیکن اب یہ پہاڑیاں ایک ایسی عمارت کے اندر واقع ہیں جہاں ہر وقت ائرکنڈیشنر چلتے ہیں۔فرش اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ ننگے پاؤں اس پر چلنا مشکل

ہوتا ہے۔ ماضی میں یہاں حدت کی وجہ سے چلنا مشکل تھا اور آج ٹھنڈک کی وجہ سے۔

صفا کے قریب پہنچ کر سعی کی دُعا مانگی:

’’یا اللہ! مَیں (تیری رضا) کے لیے سعی کے پھیروں کی نیّت کرتا/کرتی ہوں۔تُو اسے میرے لیے آسان فرما اور قبول فرما‘‘۔

صفا سے مروہ تک پہنچنے کو ایک چکر شمار کیا جاتا ہے۔گویا ساڑھے تین چکروں میں سعی مکمل ہوتی ہے۔صفا سے مروہ کی طرف اور مروہ سے صفا کی طرف آتے ہوئے جہاں سبز ٹیوب لائٹس لگی ہوئی ہیں وہاں مَردوں کو ہر چکر میں تھوڑا سا تیز چلنا ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت حاجرہ بے چین ہو کر تھوڑا سا تیز چلتیں اور پیچھے مڑ مڑ کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتیں جو پیاس سے بِلک رہا تھا۔ہم چاروں نے بھی ایسا ہی کیا۔سات چکر پورے ہونے پر مروہ کے قریب دو نفل ادا کیے۔ابھی حلق یا قصر کا مرحلہ باقی تھا۔حلق کا مطلب ہے اپنے سر کے تمام بال اتروانا اور قصر کا مطلب ہے سر کے تمام بالوں کا چوتھائی حصہ اُتروانا۔ہم چاروں مسجد الحرام سے باہر آئے۔ باہر نکلتے ہی ہمیں چند لوگوں نے کھینچنا شروع کر دیا۔یہ حجام تھے جنھوں نے احرام سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم عمرہ کر کے آئے ہیں اور اب حلق یا قصر کروانے آئے ہیں۔اکٹھے چار گاہک دیکھ کر ہر حجام ہمیں کھینچ رہا تھا۔ ناصر اکبر صاحب نے ایک سے اُجرت دریافت کی تو اُس نے فی آدمی پانچ ریال مانگے، چنانچہ ہم اس کے ساتھ اس کی دکان کی طرف چل دیے۔باری باری ہم نے حلق کروایا۔اب ہمارا عمرہ مکمل ہو گیا تھا۔اگرچہ ہم نے احرام باندھا ہوا تھا لیکن احرام کی پابندیاں ختم ہو چکی تھیں۔ نمازِ فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد ہم نے ٹیکسی پکڑی اور اپنے ہوٹل میں پہنچ گئے۔

اللہ کا مہمان ہے، اللہ کے گھر میں

a

مَیں نے اِسے ایک دنیا دار واعظ کا مشورہ جانا اِس لیے دِل ہی دِل میں طے کرلیا کہ وہی کروں گا جو میرا دِل کہتا ہے۔ان کی تسلی کے لیے بولا: ’’بھائی صاحب! مَیں نے اب تک اپنی ساری توانائیاں اِسی شہر کی سڑکوں، گلیوں، کوچوں، میدانوں اور مقدس مقامات کی چڑھائیوں اور اُترائیوں کے لیے تو بچا رکھی تھیں۔ دھکے کیا یہاں تو مَیں ٹھوکریں کھانے کو بھی تیار ہوں‘‘۔

دھکے اور ٹھوکریں

مَیں اگرچہ ساری رات جاگتا رہا تھا،لیکن کمرے میں آنے کے بعد نیند کچھ روٹھ سی گئی تھی۔ میرے ساتھی سعد شیخ اور سعید سکندر سکون کی نیند سو رہے تھے۔انھیں سوتا چھوڑ کر مَیں ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ناشتا کیا۔چائے پی۔ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ یہ دراصل سڑکوں،دکانوں اور ہوٹلوں سے آشنائی پیدا کرنے کی کوشش تھی تاکہ اگر کہیں کھو جاؤں تو آسانی سے واپس آسکوں۔ ہر طرف عازمین حج دکھائی دے رہے تھے۔بیش تر پاکستانی تھے۔نہایت شاندار بسیں اِدھر سے اُدھر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔کچھ مسجد الحرام کی طرف جارہی تھیں اور کچھ اُدھر سے حاجیوں کو لے کر واپس آ رہی تھیں۔عرب کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔حتیٰ کہ بسوں کے ڈرائیور، ہوٹلوں کے ملازم بھی پاکستانی یا انڈین تھے۔لگتا تھا کہ حج کے دِنوں میں عرب کہیں چھپ گئے ہیں۔کافی دیر گھومنے کے بعد موبائل سکرین پر وقت دیکھا تو تقریباً 11 بج چکے تھے۔ مَیں نے چائے کا ایک کپ خریدا اور لے کر اپنے ہوٹل میں آ گیا۔سعودی عرب میں آپ کھانے پینے کی کوئی بھی چیز خریدیں ڈسپوزایبل برتنوں میں ملے گی۔دھونے کا جھنجھٹ نہ نقصانِ صحت کا اندیشہ۔ سب کچھ عین حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق۔آپ مکّہ مکّرمہ یا مدینہ منّورہ میں کسی بھی دکان سے کوئی بھی ڈسپوزایبل برتن مفت میں مانگ سکتے

ہیں۔ چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے، اپنے ہوٹل پہنچا تو ایک پاکستانی حاجی صاحب مل گئے جو شاید ابھی ابھی سو کر اُٹھے تھے۔ غالباً وہ بھی عمرہ کرنے کے بعد صبح سویرے اپنے کمرے میں پہنچے تھے۔ بولے: ''کیا ارادے ہیں جناب!''

مَیں نے کہا: ''میرا دِل چاہ رہا ہے کہ مسجد الحرام چلا جاؤں''۔ کہنے لگے: ''دو دن کے بعد ہمیں منیٰ جانا ہے۔ وہاں بہت زیادہ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ تھک جاؤ گے۔ اپنی توانائی بچاؤ۔ یہاں سے ٹیکسی پر جاؤ گے تو مفت میں پچاس، سو ریال خرچ ہو جائیں گے۔ ضرور سڑکوں پر دھکے کھانے ہیں؟ کمرے میں آرام کرو۔ واپسی پر بھی بہت مشکل ہو گی۔ مسجد الحرام سے پیدل آنا پڑا تو لگ پتا جائے گا''۔

دِل سے سوچنے والے دیوانے بھلا ایسی عقل کی باتیں کہاں سنتے ہیں؟ مَیں نے اِسے ایک دنیا دار واعظ کا مشورہ جانا اِس لیے دِل ہی دِل میں طے کر لیا کہ وہی کروں گا جو میرا دِل کہتا ہے۔ ان کی تسلی کے لیے بولا: ''بھائی صاحب! مَیں نے اب تک اپنی ساری توانائیاں اِسی شہر کی سڑکوں، گلیوں، کوچوں، میدانوں اور مقدس مقامات کی چڑھائیوں اور اُترائیوں کے لیے تو بچا رکھی تھیں۔ دھکے کیا یہاں تو مَیں ٹھوکریں کھانے کو بھی تیار ہوں''۔

سندھی ڈرائیور

ویسے بھی یہ بات معیوب ہے کہ آپ جس کے مہمان ہوں، اسے چھوڑ کر کسی اور کے گھر چلے جائیں۔ مَیں اللہ کا مہمان تھا۔ سو زیادہ وقت اسی کے گھر کے آس پاس رہنا چاہتا تھا۔ سو اپنے کمرے میں گیا، ہینڈ بیگ لیا، آبِ زم زم کے لیے ہاف ہاف لیٹر کی دو تین خالی بوتلیں رکھیں اور باہر سڑک پر آ گیا۔ ایک ٹیکسی روکی تو

ڈرائیور نے سو ریال مانگ لیے۔ اُسے جانے دیا۔ دوسری روکی تو پچاس ریال کی آواز سننے کو ملی۔ یہ دونوں ڈرائیور عرب تھے اور حج کے سیزن میں پورے سال کی کمائی کرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ اچانک ایک ٹیکسی میرے پاس آ کر رکی ڈرائیور چہرے مہرے سے پاکستانی لگتا تھا۔ نوجوان تھا۔ اس نے صرف بیس ریال مانگے۔ میں جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور سے بات چیت شروع ہوئی تو پتا چلا کہ اس کا تعلق سندھ کے علاقے گھوٹکی سے ہے۔ سُود پر رقم لے کر سعودی عرب آیا ہے۔ گاڑی کا مالک کوئی عرب ہے جو اس سے روزانہ ایک سو اَسّی ((180 ریال کرایہ وصول کرتا ہے۔ یہ نوجوان بھی چاہتا تو اوور چارجنگ کر کے مسجد الحرام کے دو پھیروں ہی میں ایک سو اسی ریال کما سکتا تھا لیکن اس کے دِل میں اللہ کے مہمانوں کے لیے درد تھا۔ بولا: ''آپ خانہ کعبہ جا کر میرے لیے دُعا کیجیے گا کہ مَیں جلد از جلد سُود سے نجات پا لوں''۔

گاڑی سے اُتر کر مَیں نے اسے بیس ریال دیے تو مروت کے مارے وہ لینا نہیں چاہتا تھا، لیکن میرے اصرار پر لے لیے۔ مَیں نے اسے مشورہ دیا کہ فی الحال وہ مروت، لحاظ اور شرم کو عرب ڈرائیوروں کی طرح بھول جائے ورنہ ساری عمر سُود کے جال سے چھٹکارا نہ پا سکے گا۔

کبوتر اُڑاتے شُرطے

مسجد الحرام کا بابِ ملک عبدالعزیز مجھے بہت پسند ہے اِس لیے میں اسی میں سے اندر داخل ہوا۔ اس دروازے کی انفرادیت یہ ہے کہ آپ کو باہر سے ہی بیت اللہ شریف دکھائی دے جاتا ہے۔ ابھی نماز کا وقت نہیں تھا لیکن ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے لوگ خانہ کعبہ کے اردگرد صَف بہ صَف بیٹھے ہوئے تھے۔ راستے

میں نماز کے لیے بیٹھے ہوئے لوگوں کو وردی میں ملبوس شُرطے اور عربی لباس پہنے ہوئے حج کے لیے رکھے گئے عارضی خدمت گار، تالیاں بجا بجا کر اُٹھاتے۔ یہ منظر مجھے خاصا دلچسپ لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ حاجیوں کو نہیں اُٹھا رہے، کبوتروں کو اُڑا رہے ہیں۔ مطاف کے اندر گھومنے والے شُرطوں میں سے کسی کے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہوتا۔ سیکیورٹی کا سارا کام وہ اپنی آنکھوں اور ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ کسی کو گھور کر دیکھ لیا، کسی کو دھکیل دیا، کسی کو روک لیا اور بس۔ حج کے دِنوں میں سعودی حکومت طلبہ و طالبات کو حرم کے مختلف مقامات پر کھڑا کر دیتی ہے تاکہ حاجیوں کی راہ نمائی کی جا سکے۔ دروازوں پر برقع پوش نوجوان لڑکیاں بھی کھڑی تھیں۔ یہ سب کو عقابی نگاہوں سے دیکھتیں اور جسے جی چاہتا، تلاشی کے لیے روک لیتیں حتیٰ کہ مردوں کو بھی۔

ظہر کی نماز کے بعد میں بابِ ملک عبدالعزیز کی سیڑھیوں کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ موبائل فون کی بیل بجی میری بیٹی اُجالا کا فون تھا۔ کم عمری ہی میں اس کے اندر دین کی محبت پیدا ہوگئی ہے۔ نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتی ہے۔ بیت اللہ شریف کی زیارت کرنے کی تمنّا اس کے دِل میں جاگزیں ہے۔ کہنے لگی: ''بابا! مَیں آپ کو وٹس ایپ پر ویڈیو کال کرتی ہوں۔ مجھے خانہ کعبہ دکھا دیجیے''۔

سعودی موبائل کمپنیوں نے حج کے دِنوں میں وٹس ایپ اور میسنجر سروس بند کر رکھی تھی اِس لیے مَیں نے ایمو (Imo) پر ویڈیو کال کرنے کو کہا تو چند لمحوں کے بعد اس کی کال آ گئی۔ موبائل کے کیمرے کا رخ میں نے خانہ کعبہ کی طرف کر دیا اور بات کرتے کرتے بابِ ملک عبدالعزیز کی سیڑھیوں پر آ گیا جہاں سے ہزاروں لوگ نماز ادا کرنے کے بعد باہر کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ نوجوان، لوگوں کی راہ نمائی کے لیے کھڑے تھے۔ ان کی وردی سے مَیں نے اندازہ لگایا

کہ یہ اسکاؤٹ ہیں۔ ایک اسکاؤٹ نے مجھے سیڑھیوں میں کھڑے دیکھا تو اس نے باہر کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ مَیں نے فون کان سے ہٹایا اور نوجوان کو انگریزی میں بتایا کہ پاکستان کے شہر لاہور کے ایک کالج میں پڑھاتا ہوں۔ میرا ایک ہی جملہ سُن کر اس کا رویّہ بدل گیا۔ دوسرا اسکاؤٹ مجھے وہاں سے ہٹانے کے لیے آگے بڑھا تو پہلے والے نے اسے میرے بارے میں عربی میں کچھ بتایا تو وہ وہیں رک گیا۔ استاد کا احترام دراصل ایک آفاقی قدر ہے اور یہ ہر قوم میں مشترک ہے، یہاں آ کر یقین آیا۔

اللہ میاں کے نام، اُجالا کا خط

جب تمام گھر والے خانہ کعبہ کے منظر دیکھ چکے تو اُجالا نے پوچھا: ''آپ نے اللہ میاں تک میرا پیغام پہنچا دیا؟'' دراصل اُجالا نے مجھے اللہ میاں کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا۔ مجھے نہیں علم کہ اس نے اس میں کیا لکھا تھا۔ ویسے بھی میرے والد صاحب نے بچپن ہی میں ہم سب بہن بھائیوں کو یہ بات سکھا دی تھی کہ کبھی کسی کا خط اس کی اجازت کے بغیر مت پڑھیں۔ سو مَیں نے اُجالا کا خط کھول کر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اُس نے کہا تھا کہ اُس کا خط خانہ کعبہ کے قریب رکھ دوں، چنانچہ مَیں نے اپنے بیگ میں سے اُس کا خط نکالا اور خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ لگا کر ایک ایسی جگہ پر رکھ دیا جہاں کسی کے قدم نہیں پڑتے۔ اُجالا، احسن، جواد، ارفع اور اُن کے دوستوں نے بھی مجھے اپنے اپنے قلم دیے تھے اور کہا تھا کہ اِن سب کو خانہ کعبہ کی دیوار سے مَس کر کے واپس لے آؤں۔ مَیں جو بچپن ہی سے قلم کی حُرمت کا قائل ہوں، کیسے ممکن تھا کہ اپنے بچوں کی یہ معصوم خواہش پوری نہ کرتا۔ سو یہ کام بھی کیا۔ ہر قلم قیمتی ہوتا ہے، لیکن بچوں کے قلم، خانہ

کعبہ کے لمس سے اور بھی قیمتی ہو گئے تھے۔ مَیں نے اپنا فاؤنٹین پن بھی خانہ کعبہ سے مَس کیا۔ شاعری ہو یا نثر، مَیں ہمیشہ سیاہ روشنائی سے لکھتا ہوں۔ کئی بار سوچتا رہتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ دوسروں کی طرح نیلے رنگ کی روشنائی سے کیوں نہیں لکھ پاتا؟ خانہ کعبہ کی سیاہ دیواریں اور سیاہ غلاف دیکھ کر اِس سوال کا جواب مل گیا تھا۔

حج کے دِنوں میں خانہ کعبہ کا سیاہ غلاف لپیٹ دیا جاتا ہے۔ سبب اِس کا یہ ہے کہ دُنیا بھر سے آئے ہوئے عازمینِ حج قینچی یا بلیڈ سے غلافِ کعبہ کا تھوڑا تھوڑا ٹکڑا کاٹ لیتے ہیں۔ اُن کی اِس عقیدت کو چوری کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا، لیکن سعودی حکومت نے اِس کا حل یہی نکالا ہے کہ حج کے دِنوں میں غلاف کو لپیٹ دیا جائے۔

عشا کی نماز کے بعد تک مسجد الحرام میں موجود رہا۔ ہوٹل جانے کے لیے باہر نکلا تو ٹیکسیاں کم تھیں اور واپس جانے والے لوگ زیادہ تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈرائیوروں نے ریٹ بڑھا دیے۔ مَیں نے ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑے چند پاکستانی ڈھونڈ لیے جو عزیزیہ جا رہے تھے۔ ہم سب نے امریکن سسٹم کے تحت ایک ٹیکسی لی اور عزیزیہ آ گئے۔

میرے ہوٹل کے باہر ایک نوجوان بائیسکل لیے کھڑا تھا۔ بائیسکل دیکھ کر میرا جی چاہا کہ اس سے بائیسکل لے لوں اور جہاں تک مکّہ مکّرمہ کی سڑکوں پر گھوم پھر سکتا ہوں، جاؤں۔ مَیں نے اُس نوجوان سے بائیسکل مانگی تو بولا: ”آپ حاجی ہیں۔ آپ کو سعودی پولیس بائیسکل چلانے کی ہرگز اجازت نہیں دے گی۔ وہ آپ سے بائیسکل چھین لے گی۔ ویسے بھی یہاں کی ٹریفک بہت خطرناک ہے“۔

نوجوان کی بات میں وزن تھا۔ سو مَیں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

”مَیں زندہ ہوں“

اگلے روز مَیں اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات دِل و دماغ میں مچل رہے تھے۔ مَیں اپنے بچوں سے ہزاروں کلومیٹر دور تھا۔ سب مجھے یاد آ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ مَیں قبر میں لیٹا ہُوا ہوں، جہاں منکر نکیر کے سِوا اب اور کوئی نہیں آ سکتا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اپنے بچوں کو مَیں اب دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ پاکستان چھوڑ کر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مَیں نے دُنیا ہی چھوڑ دی ہے۔ بار بار سوچ رہا تھا کہ زندہ بھی ہوں یا نہیں؟ پھر اچانک میرے دِل میں ایک خیال پیدا ہُوا۔ مَیں زندہ ہوں، مَیں زندہ ہوں۔ مَیں اپنے بچوں کے روپ میں زندہ ہوں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں اپنی کچھ صفات رکھ دی ہیں اِسی طرح وہ ہر انسان کی صفات اس کی اولاد میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ہر انسان مرنے کے بعد اپنے بچوں کی شکل میں زندہ رہتا ہے۔ مَیں سوچنے لگا کہ میرے کون سے بچے میں کون کون سی صفات اور عادات ہیں؟ اُجالا کو دھیان میں لایا تو احساس ہُوا کہ وہ زلزلے، سیلاب اور قدرتی آفات سے ڈر جاتی ہے۔ ذرا سی بات پر رو دیتی ہے۔ مَیں بھی تو ایسا ہی ہوں۔ مَیں کسی کو انجکشن لگتے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ احسن کے بارے میں سوچا تو کم عمری ہی میں اس کی سنجیدگی مجھے اپنی شخصیت کا بچھڑا ہوا حصہ لگی۔ وہ خواب میں حضور پاکؐ کی زیارت بھی کر چکا ہے۔ شاید اس عقیدت بھری زیارت نے اسے نہایت سنجیدہ بنا دیا ہے۔ مجھے اس کی سنجیدگی میں اپنی ذات کا عکس دکھائی دیا۔ جواد کو سوچا تو اس کی شرارتیں یاد آنے لگیں۔ وہ اپنے بچپن کا بھرپور طریقے سے لطف اٹھاتا ہے۔ مَیں نے اپنے اندر جھانکا تو احساس ہُوا کہ مَیں بھی اپنے اندر ہر وقت ایک بچہ لیے پھرتا ہوں جو قدم قدم پر زندگی کے نئے

منظروں کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ ارفع بچوں سے بہت پیار کرتی ہے۔ آپ اِس کے پاس کوئی بچہ کھڑا کر دیں۔ وہ ارفع سے فوراً مانوس ہو جائے گا۔ کوئی بچہ اِس سے دور جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ میرا اپنا بھی یہی حال ہے۔ بچے میری طرف آپ ہی آپ آتے ہیں۔ مَیں جس بچے کی طرف دیکھ لوں، وہ مجھ سے اٹھکیلیاں کرنے لگتا ہے۔

اپنے بچوں کی شکلیں، باتیں اور عادتیں دھیان میں لاتے ہی مجھے یوں لگا کہ مَیں زندہ ہوں۔ مر بھی گیا تو اپنے بچوں کی شکلوں، باتوں اور عادتوں میں زندہ رہوں گا۔ زندگی اور موت کے ٹکراؤ میں اُبھرنے والے خیالات سے جان چھڑانے کے لیے مَیں اُٹھا اور ایک بار پھر پورا دن مسجد الحرام میں خانہ کعبہ کے آس پاس گزارنے کے لیے چل دیا۔

لبّیک کی صدائیں ہیں خیموں کے شہر میں

b

راستا پوچھنے کی ضرورت اِس لیے پیش نہیں آئی کہ جدھر احرام باندھے لوگوں کے قافلے رواں دواں تھے ہم بھی اسی طرف چل پڑے تھے۔ سب کی منزل ایک ہی تھی۔ سارے راستے اور سارے قافلے ایک ہی منزل کی طرف جا رہے تھے۔ یہ وہ راستا تھا جس میں کسی قافلے کو راہ زن کا کھٹکا نہیں تھا۔ ہر شخص اور ہر قافلہ ایک دوسرے کا مددگار اور محافظ تھا۔ مکّہ مکرّمہ پر مجھے جنّت کا گمان ہو رہا تھا۔ جنّت ایسی ہی جگہ ہو گی جہاں کسی کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔

مکتب نمبر 62

بالآخر وہ دن آ گیا جس کا مجھ سمیت تمام عازمینِ حج کو انتظار تھا۔ یہ آٹھ ذوالحجہ کا دن تھا، یعنی مناسکِ حج کے آغاز کا دن۔ عبادت کا یہ عمل مسلسل پانچ دن جاری رہتا ہے۔ نمازِ فجر اپنے کمرے میں پڑھنے کے بعد مَیں اپنے گروپ لیڈر شکیل کے کمرے میں چلا گیا، جہاں بلال اور الطاف بھی موجود تھے، ہم نے باہر جا کر ایک ہوٹل سے ناشتا کیا۔ دوبارہ کمرے میں آئے۔ باری باری غسل کیا۔ نیا احرام باندھا۔ سر ڈھانپ کر دو رکعت نفل ادا کیے۔ سلام پھیر کر سر ننگا کیا اور حج کی نیّت کی۔

ترجمہ: ''یا اللہ مَیں (تیری رضا اور خوش نودی کے لیے) حج کی نیّت کرتا ہوں۔ تو اِسے میرے لیے آسان فرما اور (اپنی جناب میں) قبول فرما''۔

نیّت کرنے کے بعد ہم چاروں نے تلبیہ پکارنا شروع کر دیا۔ درود شریف بھی پڑھتے جاتے اور دُعائیں بھی مانگتے جاتے، چونکہ احرام کی پابندیاں ایک بار پھر شروع ہو گئی تھیں اس لیے اب مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مَیں دُنیا کی ساری آلائشوں سے پاک ہو گیا ہوں۔ پتا نہیں کیوں یہ مصرع مجھے بار بار یاد آ رہا تھا:

دِل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

جب مجھے عزیزیہ کی بلڈنگ نمبر ایک میں کمرا ملا تھا تو یہ سوچ کر پریشان تھا کہ

یہاں سے منیٰ کیسے جاؤں گا؟ پرائیویٹ اور سرکاری حاجیوں کو منیٰ لے جانے کے لیے نہایت عمدہ بسیں آ جاتی ہیں۔ ہم تھے تو پرائیویٹ سکیم کے حاجی، لیکن ہمیں بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ کب اور کون سی گاڑی ہمیں منیٰ لے جائے گی۔ حتیٰ کہ ہمیں یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ ہمارا مکتب نمبر کیا ہے؟ ہر حاجی کو منیٰ روانہ ہونے سے پہلے مکتب نمبر کے بارے میں بتا دیا جاتا ہے۔ مکتب سے مراد دراصل خیمہ ہے۔ حاجیوں کو مختلف مکتب نمبر الاٹ کر دیے جاتے ہیں اور وہ منیٰ میں صرف اسی مکتب کے خیمے میں قیام کر سکتا ہے جو اسے الاٹ کیا جاتا ہے۔ مَیں نے حاجی مقبول احمد صاحب سے فون پر رابطہ کیا تو انھوں نے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بھی حل کر دیا اور مکتب نمبر کا بھی۔ کہنے لگے: ''منیٰ عزیزیہ سے بمشکل ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ آپ ایک چھوٹی سی سُرنگ پیدل پار کریں اور منیٰ پہنچ جائیں۔ وہاں مکتب نمبر باسٹھ، حاجی طالب حسین کے ساتھ آئے ہوئے عازمینِ حج کے لیے مخصوص ہے، آپ چاروں اس میں چلے جائیے''۔

پاکستانیوں کے لیے کُل ایک سو دس مکتب تھے۔ ہر مکتب میں حاجیوں کی تعداد مختلف تھی۔ شروع کے نمبروں والے مکتب منیٰ کے آغاز ہی میں ہوتے ہیں اور آخری نمبروں والے مکتب منیٰ کے آخری کونے میں۔ اگر آپ کا حج پیکیج مہنگا ہے تو آپ کو قریب ترین مکتب ملے گا اور اگر سستا ہے تو پھر آپ منیٰ کے آخری کونے میں موجود مکتب میں بھیجے جائیں گے۔ ہمارا مکتب نمبر باسٹھ درمیان میں تھا۔ گویا ہم متوسط طبقے کے حاجیوں کے ساتھ متوسط طبقے والا سلوک روا رکھا گیا۔

راستے اور قافلے

ہم نے پانچ دِنوں کے لیے ہوٹل کے کمرے کو خدا حافظ کہا۔ ضرورت کی کئی

چیزیں اپنے ساتھ رکھ لی تھیں۔ ہینڈ بیگ، چھتری، پانی کی بوتلیں، کچھ کھانے پینے
کی چیزیں (جن میں کھجوریں بھی شامل تھیں) فوم کا ایک گدّا، جو مَیں نے تیس
ریال میں عزیزیہ کے ایک سٹور سے خریدا تھا۔فوم کا یہ گدّا مزدلفہ کے میدان میں
کام آتا ہے، جہاں بجری اور سیمنٹ کی پختہ اور گرم سڑک پر کھلے آسمان تلے رات
گزارنا ہوتی ہے۔کچھ لوگ گدّے کے بجائے چٹائیاں لے جاتے ہیں۔ بہت
سے دونوں کے بغیر ہی گزارا کرتے ہیں اور حج کا اصل مزہ اور زیادہ ثواب حاصل
کرتے ہیں۔

سڑک پر جدھر نظر جاتی تھی سفید احرام میں لپٹے ہوئے عازمینِ حج منیٰ کی طرف
جاتے دکھائی دے رہے تھے۔کاریں، ٹیکسیاں اور بسیں بھی عازمینِ حج کو لاد کر
منیٰ کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ پہلے تو یہ گاڑیاں دیکھ کر دِل میں خیال آیا
کہ ہم پیدل کیوں ہیں؟ لیکن پھر حاجی مقبول احمد صاحب کی بات یاد آئی۔انھوں
نے کہا تھا کہ پیدل جانے والے لوگ منیٰ جلدی پہنچیں گے، کیونکہ بسیں اور
ٹیکسیاں ٹریفک کے ہجوم میں گھنٹوں پھنسی رہتی ہیں۔ چنانچہ ہم تیز تیز قدم اٹھانے
لگے۔میرے اندر ایک عجیب سا جوش پیدا ہو گیا تھا۔خوشی بھی تھی اور سرشاری
بھی۔اگرچہ راستا، چڑھائی کا تھا،لیکن ہر قدم پر یوں لگ رہا تھا جیسے میری بیٹری
خودبخود چارج ہو رہی ہے۔ہمیں کسی سے منیٰ کا راستا پوچھنے کی ضرورت اِس لیے
پیش نہیں آئی کہ جدھر احرام باندھے لوگوں کے قافلے رواں دواں تھے ہم بھی اسی
طرف چل پڑے تھے۔سب کی منزل ایک ہی تھی۔سارے راستے اور سارے
قافلے ایک ہی منزل کی طرف جا رہے تھے۔یہ وہ راستا تھا جس میں کسی قافلے کو
راہ زن کا کھٹکا نہیں تھا۔ ہر شخص اور ہر قافلہ ایک دوسرے کا مددگار اور محافظ تھا۔مکّہ
مکرّمہ پر مجھے جنّت کا گمان ہو رہا تھا۔جنّت ایسی ہی جگہ ہو گی جہاں کسی کو کسی

سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔

ابھی ہم دو چار سو قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک موڑ آیا۔مڑ کر دیکھا تو سامنے
ایک پہاڑی راستا تھا اور سرنگ بھی دکھائی دے رہی تھی۔راستے میں جگہ جگہ
مقامی لوگ اللہ کے مہمانوں کے لیے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور کھانے پینے کی
چیزیں گاڑیوں، ٹرکوں اور کنٹینروں میں لیے کھڑے تھے۔یہ سب مہربانی کا
سامان تھا۔سب کچھ مفت دیا جا رہا تھا۔ ہمارے میزبانِ حقیقی نے اپنے نوازے
ہوئے کچھ لوگوں کو دُنیا بھر سے آئے ہوئے اپنے مہمانوں کی خدمت پر مامور کر
دیا تھا۔حاجیوں سے زیادہ ثواب تو یہ لوگ حاصل کرتے ہوں گے۔حاجی تو اللہ کی
عبادت کرنے جاتے ہیں اور یہ لوگ اللہ کی مخلوق کے آرام کا خیال کرتے ہیں۔ہم
حاجی تو اپنی غرض کے بندے ہیں۔اپنے گناہ بخشوانے جاتے ہیں اور یہ لوگ
اپنے جیسے لوگوں کی تھکن، بھوک اور پیاس اپنے نام کر کے اپنی دُنیا ہی کو جنّت بنا
لیتے ہیں۔

خدمت کا کاروبار

سُرنگ چونکہ ایک چڑھائی کے راستے پر تھی اس لیے وہاں کچھ خالی ٹیکسیاں اور
بسیں کھڑی تھیں۔آپ بیس ریال فی مسافر دے کر ان میں بیٹھ جائیے اور منیٰ پہنچ
جائیے۔بوڑھوں، کمزوروں، عورتوں اور بچوں کو تو فائدہ ہوتا ہی ہے، گاڑیوں کے
مالکوں کی جیب بھی بھاری ہو جاتی ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ مکّہ مکرّمہ کے
مضافات میں رہنے والے غریب اور متوسط طبقے کے عرب نوجوان موٹر سائیکلیں
لے کر وہاں کھڑے تھے وہ تھک جانے والے حاجیوں کے پاس جاتے، ان سے
سودے بازی کرتے اور پچاس یا سو ریال لے کر منیٰ چھوڑ آتے۔کچھ مقامی لوگ

وِیل چیئرز لے کر کھڑے تھے۔ یہ بھی خوب مال بنا رہے تھے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ حقیقت میں یہ سب بھی اللہ کے مہمانوں کی خدمت کر رہے تھے۔ چاہتے تو یہ اسی مقام پر کھڑے ہو کر بھیک بھی مانگ سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے لیے خدمت کا راستہ چُنا تھا۔

ہم چاروں نے فیصلہ کیا کہ یہ سُرنگ پیدل ہی پار کریں گے۔ سُرنگ کے اندر پہنچے تو اندر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سعودی عرب کی دوسری سرنگوں کی طرح اس میں بھی خود کار پاور جنریٹر لگا ہوا تھا۔ ہم ستانے کے لیے فٹ پاتھ کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی عارضی دیوار پر بیٹھ گئے اور جو ہمیں ایک مہربان نے تھما دیئے تھے۔ پھل کھانے لگے۔ ٹھنڈا پانی بھی پیا۔ ہم نے دِل ہی دِل میں اللہ کا شکر اور لذتِ کام و دہن کے سامان کا وسیلہ بننے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ مجھے ایک بار پھر اپنا یہ شعر یاد آ گیا:

مَیں جو دن رات ترا شُکر اَدا کرتا ہوں
تو سمجھ یہ بھی مِرا حسنِ طلب ہے مولا!

پتا نہیں کیوں؟ یہاں بیٹھ کر مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ ایک غریب آدمی نے اپنے ایک دوست کو بتایا کہ وہ حج کرنے کے لیے سعودی عرب جا رہا ہے تو اس کے دوست نے کہا: ''یار تم تو ریڑھی لگاتے ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم حج پر چلے جاؤ''؟ وہ شخص بولا: ''میرے بھائی ریڑھی مَیں لگاتا ہوں، میرا اللہ تو ریڑھی نہیں لگاتا''۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ ریڑھی والا مَیں ہوں، بلکہ میرے پاس تو ریڑھی بھی نہیں تھی۔ پھر پتا نہیں اللہ نے مجھے کس طرح حج کے لیے چُن لیا۔ التجا کی نہ درخواست دی۔ بات بن گئی۔

ہوٹل سے سُرنگ تک سڑک پر ہزاروں نہیں، لاکھوں کی تعداد میں ڈسپوزایبل

برتن اور پانی کی خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ جب کوئی تیز رفتار گاڑی ان کے اوپر سے گزرتی تو عجیب عجیب آوازیں بلند ہوتیں۔ بعد میں پتا چلا کہ حج کے پانچ دنوں میں مکّہ مکرّمہ کی سڑکوں، منیٰ کے خیموں، عرفات اور مزدلفہ کے میدانوں اور جمرات کے راستوں میں جمع ہونے والا ہزاروں ٹن کوڑا کرکٹ بلدیہ والے باقاعدہ نیلام کرتے ہیں اور لاکھوں ریال کماتے ہیں۔

تھوڑی دیر ستانے کے بعد ہم ایک بار پھر اُٹھے اور سُرنگ سے باہر نکل آئے۔ سامنے عجیب منظر تھا۔ ہمارے سامنے منیٰ کا میدان تھا۔ خیموں کا ایک وسیع و عریض شہر آباد تھا۔ بظاہر یہ خیمے ہوتے ہیں، لیکن دراصل یہ تھری سٹار ہوٹل کے کمروں کی طرح ہیں۔ ہر وقت ان میں اے سی چلتے رہتے ہیں۔ جہاں اے سی نہ ہوں وہاں روم کولر اور پنکھے چلتے ہیں۔ ان میں فوم کے موٹے موٹے گدّے بچھے ہوتے ہیں۔ لیٹنے کا موڈ نہ ہو تو آپ ان گدّوں کو صوفے میں بھی بدل سکتے ہیں۔ مَیں سمجھا تھا کہ مکتب نمبر باسٹھ قریب ہی ہو گا، لیکن اپنے مکتب تک پہنچنے کے لیے ہمیں تقریباً ایک گھنٹا پیدل چلنا پڑا۔ شدت کی گرمی تھی، لیکن سعودی حکومت نے کھمبوں کے اوپر نہایت ماڈرن شاور لگا رکھے تھے، جو ننھی ننھی بوندوں کی شکل میں آتے جاتے لوگوں پر ٹھنڈا پانی برسا رہے تھے۔ اسے آپ مصنوعی بارش بھی کہ سکتے ہیں۔

حج کیا ہے؟

ہم مکتب نمبر باسٹھ میں پہنچے تو وہاں حاجی صاحبان نرم نرم گدّوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ مسلسل قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے اور کچھ دل ہی دل میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ اندر اگرچہ ہمارے لیے جگہ نہیں تھی لیکن پہلے سے موجود حاجیوں

نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمیں خوش آمدید کہا اور ایک دوسرے کے ساتھ ہو کر بیٹھ گئے۔ یوں ہمارے لیے جگہ بن گئی۔ اب حج کا فلسفہ میری سمجھ میں آنے لگا۔ اللہ کی راہ میں آنے والی مشکلوں کو برداشت کرنے اور دوسروں کو آسانی دینے کے لیے خود کو مشکل میں ڈالنے کا نام حج ہے۔ حج نمائش، دکھاوے اور تکبر کا نام نہیں بلکہ ندامت سے سمٹنے اور عجز کا نام ہے۔

ہم سب نے اسی خیمے میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی باجماعت نمازیں ادا کیں۔ اِن خیموں میں کھانے، پانی اور چائے کی فراہمی مسلسل جاری رہتی ہے۔ ہر چیز چونکہ مفت ملتی ہے اس لیے خیموں میں موجود بیش تر لوگ ہر چیز فوراً کھا جاتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ حج کے پانچ دِنوں میں آپ جتنا کم کھائیں، بہتر ہے۔ سعودی حکومت منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں بیت الخلا بناتی ہے، لیکن حاجیوں کی زیادہ تعداد کے باعث یہ بھی تھوڑے رہ جاتے ہیں۔ ہر بیت الخلا کے باہر لمبی لمبی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ قطار توڑ کر آپ بیت الخلا جا نہیں سکتے۔ قطاروں میں لگے لوگ وہی ہوتے ہیں جو مفت ملنے والی ہر چیز کھانا فرض جانتے ہیں۔

دوسرے حاجیوں کی طرح رات ہم چاروں نے اسی خیمے میں گزاری۔ مَیں نے رات کو کسی کو خیمے میں سوتے نہیں دیکھا۔ خود بھی جاگتا رہا۔ لبیک کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ ہر خیمے کے ساتھ ہی عورتوں کا خیمہ بھی ضرور ہوتا ہے تا کہ ایک ساتھ حج کے لیے آنے والے میاں بیوی ایک دوسرے کے قریب رہیں۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ منیٰ کے آغاز ہی میں مجھے بعض نہایت عالی شان خیمے اور کمرے دکھائی دیے جن میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ حفاظت کے لیے سرکاری عملہ مامور تھا۔ یہ عالی شان خیمے اور کمرے سعودی حکومت کے مہمان حاجیوں کے لیے

ہوتے ہیں۔

نو ذوالحجہ کو فجر کی نماز اپنے خیمے میں ادا کی۔ تکبیر تشریق پکاری اور اس کے بعد لبیک کہا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ نو ذوالحجہ فجر کی نماز سے 13 ذوالحجہ عصر کی نماز تک ہر فرض نماز کا سلام پھیرنے کے بعد بلند آواز سے تکبیر تشریق تین مرتبہ یا کم از کم ایک مرتبہ پکاریں۔

میدانِ عرفات: ایک ڈرائی کلینر

حج کے دوسرے دن کا آغاز ہو کا تھا۔ سورج طلوع ہونے کے بعد ہمیں میدانِ عرفات کی طرف روانہ ہونا تھا۔ طالب حسین صاحب نے اپنے مکتب کے لیے ایک شاندار بس کا انتظام کر رکھا تھا۔ تقریباً دس بجے ہم بس میں سوار ہوئے اور تلبیہ پکارتے ہوئے میدانِ عرفات پہنچ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے اپنے ایک دوست ڈاکٹر ظفر تسکین یاد آئے جن کا کہنا ہے کہ میدانِ عرفات ایک بہت بڑا ڈرائی کلینر ہے۔ یہاں آ کر حاجیوں کے سارے گناہ دُھل جاتے ہیں اور اگر میدانِ عرفات سے رخصت ہونے کے بعد کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اب بھی اس کے گناہ نہیں دُھلے تو وہ دراصل ایک بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ گویا مَیں بھی اب ڈرائی کلین ہونے والا تھا۔ لیکن بے شمار حاجی صاحبان کو میں نے موٹے موٹے آنسوؤں کے ساتھ روتے بھی دیکھا۔ ان کے احرام بھی بھیگ چکے تھے اور اس شعر کی تصویر تھے:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہمارے مکتب کے حاجیوں کے لیے الگ سے ایک خیمہ گاڑا گیا تھا۔ روم کولر چل رہے تھے۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ اپنا مختصر سا سامان ایک جگہ رکھا۔ میرا دِل

چاہا کہ ذرا گھوم پھر کر میدانِ عرفات دیکھوں۔ چند قدم چلا تو دیکھا کہ جُوس، دودھ اور لسّی کی ڈسپوزایبل بوتلوں سے لدا ایک ٹرک کھڑا ہے۔ بوتلیں حاجیوں میں تقسیم کی جا رہی تھیں۔ مَیں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ اچانک کسی کا ہاتھ میری عینک کو لگا اور عینک ہجوم میں گر گئی۔ بہت مشکل سے عینک ملی تو پتا چلا کہ ایک شیشا ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ البتہ کمانیاں دونوں درست تھیں۔ میرے لیے ایک بہت بڑی مشکل پیدا ہوگئی تھی۔ میرے پاس دوسری عینک بھی نہیں تھی۔ اس حادثے سے فوری سبق یہ ملا کہ عینک لگانے والے لوگ حج یا عمرے کے لیے جائیں تو ایک اضافی عینک ساتھ لے کر جائیں۔ سعودی عرب میں عینک بنوانا آسان کام نہیں۔ ماہرِ امراضِ چشم کے سوا کوئی آپ کی نظر چیک کرنے کا مجاز نہیں۔ اس کی فیس بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ عینک اس سے بھی زیادہ پیسوں میں بنتی ہے۔ نظر چیک کروانے اور عینک بنوانے میں آپ کے تقریباً پانچ سو ریال خرچ ہو سکتے ہیں۔ یعنی تقریباً 15 ہزار روپے۔ میرے لیے بہت بڑی مشکل کھڑی ہو گئی تھی۔ عینک کے بغیر میرے لیے ایک قدم بھی چلنا محال ہو رہا تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔ میرے ساتھیوں کو اس ''حادثے'' کا پتا چلا اور مجھے ایک شیشے والی عینک لگائے دیکھا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ عینک کا ایک شیشا سلامت ہے۔ اگر تم ایک شیشے والی عینک مسلسل لگائے رکھو گے تو دوسری آنکھ کی بینائی مزید کم ہو جائے گی اور سر میں بھی شدید درد ہوگا اس لیے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ تم فولڈ کر کے ٹشو پیپر رکھ لو۔ یہ نسخہ تیر بہ ہدف ثابت ہوا۔ اب مجھے ایک شیشے سے بھی سب کچھ اچھا دکھائی دے رہا تھا۔

مُزدلفہ کا میدان ہے مخلوق کا بستر

C#

اللہ اللہ کیا منظر تھا! سبحان اللہ! دُنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے نہایت طاقتور، حسین، امیر، مضبوط اور بااثر لوگ دُنیا بھر سے آئے ہوئے کمزوروں، بدصورتوں، غریبوں اور مظلوموں کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ مساوات، انصاف اور برابری، یہی اسلام کا سبق ہے اور اسی میں تمام قوموں کی نجات ہے۔ مزدلفہ میں مساوات، انصاف اور برابری کا یہ نظارہ ایک بار تو سب کو حیران کر دیتا ہے۔

وقوفِ عرفات

عرفات کے میدان میں زمین پر بچھے قالین پر بیٹھ کر دِل مطمئن تھا کہ میرا حج مکمل ہوگیا ہے۔ یہاں مسجد نمرہ کے امام صاحب کے پیچھے ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھنا ہوتی ہیں۔ سو مَیں نے بھی دونوں نمازیں ایک ساتھ پڑھیں۔ امام صاحب نے خطبہ دیا۔ خطبہ چونکہ عربی زبان میں تھا اس لیے کچھ پتا نہیں چلا کہ امام صاحب کیا فرمارہے ہیں؟ اگر کوئی شخص امام صاحب کے پیچھے دونوں نمازیں اکٹھی نہیں پڑھتا تو اسے ظہر کے وقت ظہر اور عصر کے وقت عصر کی نماز الگ الگ پڑھنی چاہیے، لیکن مَیں نے نہیں دیکھا کہ یہاں کسی نے امام صاحب کے پیچھے نماز نہ پڑھی ہو۔

عصر کا وقت ہوا تو ہمارے خیمے میں موجود تمام لوگ قبلہ رُو ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مَیں بھی کھڑا ہوگیا۔ ہر مسلمان کا یقین ہے کہ اس مقام پر کھڑے ہو کر جو دعا مانگی جاتی ہے وہ لازماً قبول ہوتی ہے۔ سو ہر آدمی دُعائیں مانگ رہا تھا۔ کچھ لوگ بلند آواز میں دُعائیں مانگ رہے تھے اور کچھ دِل ہی دِل میں۔ بہت سے لوگوں کو مَیں نے یہاں روتے دیکھا۔ گڑگڑاتے دیکھا۔ وقوفِ عرفات کے اس عمل میں اللہ تعالیٰ کا روحانی وجود مجھے اپنے اردگرد، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر جگہ محسوس ہو رہا تھا۔ عصر اور مغرب کے درمیان، وقوفِ عرفات کا وقت سب سے قیمتی وقت

ہے۔ سو کوئی بھی اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اب ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ خواتین کو اپنے محرم کا بھی دھیان نہیں رہا تھا۔ ماؤں کو بچوں کی فکر نہیں رہی تھی۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت کسی کی فکر تھی تو اپنے ملک پاکستان کی، اپنے ہم وطنوں کی، اپنے والدین کی، اپنی اہلیہ اور بچوں کی، اپنے بہن بھائیوں کی، ان کے اہلِ خانہ اور بچوں کی، اپنے رشتے داروں کی، اپنے دوستوں کی اور اپنے رفقائے کار کی اور ان سب لوگوں کی جنھوں نے حج کے لیے روانہ ہوتے ہوئے مجھے بھیگی آنکھوں اور تڑپتے دِل کے ساتھ الوداع کیا تھا۔ مَیں ان سب کے لیے دُعا بہ لب تھا۔ میری خوشی ہمیشہ دوسروں کی خوشی سے وابستہ رہی ہے۔ سو مَیں نے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔

ضروری نہیں کہ عرفات کے میدان میں آپ کھڑے ہو کر ہی دُعائیں مانگیں، اگر آپ کی صحت یا عمر اجازت نہیں دیتی تو آپ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بھی اپنے رب سے سب کچھ مانگ سکتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہی میدانِ عرفات، میدانِ حشر بنے گا اس لیے یہاں کھڑے ہو کر آپ ہی آپ دِل میں روزِ حشر کا خیال آتا ہے۔ اس میدان میں ہر حاجی کو غروب آفتاب تک قیام کرنا ہوتا ہے۔ عرفات کے میدان کی حد بندی کے لیے بڑے بڑے بورڈ لگا کر نشان دہی کی گئی ہے۔ اگر کوئی حاجی اس حد بندی سے باہر نکل جائے تو اس کا حج نہیں ہوتا اور اگر عرفات کے میدان سے باہر نکل جانے والا شخص غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے واپس آجائے تو ٹھیک ہے بصورتِ دیگر دم واجب ہوگا، یعنی اسے ایک جانور ذبح کرنا پڑے گا۔ عرفات کے میدان میں مغرب کے وقت تک قیام کرنا ہوتا ہے البتہ مغرب کی نماز یہاں ادا نہیں کی

جاتی۔مغرب کی نماز مزدلفہ کے میدان میں پہنچ کر عشا کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھی جاتی ہے۔

عرفات کے میدان میں دُنیا بھر سے آئے ہوئے لاکھوں عازمین حج کی حفاظت کے لیے دوپہر سے مغرب تک سعودی فوج کے ہیلی کاپٹر فضا میں پرواز کرتے رہتے ہیں۔منیٰ میں بھی مَیں نے یہ ہیلی کاپٹر اڑتے دیکھے۔ان ہیلی کاپٹروں کے لیے منیٰ ہی میں ہیلی پیڈ بنایا گیا تھا۔

مزدلفہ کی طرف روانگی

ہماری اگلی منزل مزدلفہ کا میدان تھا۔لوگ اپنی بسوں میں سوار ہو چکے تھے۔ عرفات سے مزدلفہ کا فاصلہ تقریباً آٹھ کلومیٹر ہے، لیکن ہزاروں بسیں جب ایک ساتھ، ایک ہی مقام یعنی مزدلفہ کی طرف روانہ ہوتی ہیں تو ٹریفک بری طرح جام ہو جاتی ہے۔عرفات سے مزدلفہ کی طرف جاتے ہوئے ہر سڑک پر ڈسپوزایبل برتنوں کے ڈھیر دکھائی دیے۔ اتنا کوڑا کرکٹ مَیں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، لیکن یہ سب یہاں صرف پانچ دن تک رہتا ہے۔بلدیہ کے حکام اس کوڑے کرکٹ کی نیلامی کر دیتے ہیں، دو تین دن کے اندر اندر یہ سڑکیں ایک بار پھر پہلے کی طرح چمک اُٹھتی ہیں۔

ہماری بس رینگ رینگ کر رات تقریباً آٹھ بجے مزدلفہ کے میدان میں پہنچ گئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی صحرائی میدان ہوگا، لیکن یہ تو اچھا خاصا ترقی یافتہ علاقہ تھا۔ سیمنٹ اور بجری کی پختہ سڑکیں تھیں، جگہ جگہ ماڈرن باتھ روم بنائے گئے تھے، عارضی دکانیں سجی ہوئی تھیں۔حبشی عورتیں چائے، بوتلیں، بسکٹ اور کھانے پینے کی دوسری بہت سی اشیا فروخت کر رہی تھیں، جس چیز نے مجھے یہاں سب سے

زیادہ حیران کیا وہ یہ تھی کہ لاکھوں لوگ گرم اور تپتی ہوئی زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ بیٹھے تھے اور کچھ ابھی کھڑے ہوئے تھے تاکہ بیٹھنے یا لیٹنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر سکیں۔ اللہ اللہ کیا منظر تھا! سبحان اللہ! دُنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے نہایت طاقتور، حسین، امیر، مضبوط اور بااثر لوگ دُنیا بھر سے آئے ہوئے کمزوروں، بدصورتوں، غریبوں اور مظلوموں کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ مساوات، انصاف اور برابری، یہی اسلام کا سبق ہے اور اسی میں تمام قوموں کی نجات ہے۔مزدلفہ میں مساوات، انصاف اور برابری کا یہ نظارہ ایک بار تو سب کو حیران کر دیتا ہے۔ ہوٹلوں میں ٹھنڈے اور آرام دہ کمروں کے لیے شور مچانے والے عازمینِ حج یہاں چپ چاپ گرم اور پتھریلی زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہوٹل میں ٹھنڈا اور خراب کھانا ملنے پر اپنے حج آرگنائزر کے سامنے پھٹ پڑنے والے لوگ یہاں بھوکے پیاسے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے تو یہ جگہ لاہور کے بادامی باغ کے لاری اڈے جیسی لگی۔ بڑی بڑی بسیں زمین پر لیٹے ہوئے عازمین حج کے درمیان سے گزر رہی تھیں۔ ڈرائیور بھی بے باک تھے اور زمین پر پڑے لوگ بھی۔

مزدلفہ کے میدان میں

مَیں شکیل، الطاف اور بلال کے ساتھ بس سے اترا۔ ہم چاروں کو بیٹھنے یا لیٹنے کے لیے حساب کی رُو سے کم از کم آٹھ گز جگہ درکار تھی، لیکن یہاں تو دو گز زمین بھی میسّر نہ تھی۔ بالآخر سڑک کے کنارے ایک خالی جگہ دکھائی دی۔ مَیں نے عزیزیہ سے خریدا ہوا پتلا سا گدّا نکالا جو دو فٹ چوڑا اور تقریباً چھ فٹ لمبا تھا، یعنی اس پر صرف ایک آدمی لیٹ سکتا تھا، لیکن مَیں نے مساوات کے اصول کے تحت یہ گدّا

لمبائی کے بجائے چوڑائی میں بچھالیا۔ چاروں نے مغرب اورعشا کی نمازیں اکٹھی ادا کیں، پہلے مغرب کے فرض اور پھر عشا کے فرض ادا کیے، بعد میں مغرب کی سنتیں، عشا کی سنتیں، وتر اور نفل ادا کیے۔ سڑک کے کناروں، فٹ پاتھوں اور ڈیوائیڈروں پر بجری کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ ہم چاروں نے یہاں سے دوسرے لوگوں کی طرح، ستّر ستّر کنکریاں چُن کر اپنی اپنی خالی بوتلوں میں بھر لیں، کیونکہ اگلے دن، یعنی دس ذوالحجہ کو رمی کا پہلا مرحلہ تھا۔ بڑے شیطان کو سات کنکریاں مارنا تھیں، کنکریاں مارنے کا یہ عمل رمی کہلاتا ہے۔ کنکریاں جمع کرنے کے بعد ہم چاروں گدے پر یوں لیٹ گئے کہ ہماری کمریں تو گدّے پر تھیں اور ٹانگیں بجری سے بنی ہوئی گرم اور پختہ سڑک پر۔ ہم منیٰ، عرفات اور مزدلفہ تک کے سفر میں کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے، اس لیے ستانے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ مَیں حج کے اس سفر میں قدم قدم پر اپنے ٹیلیفونک مہربان ڈاکٹر خالد محمود صاحب کے والد گرامی ڈاکٹر ریاض الرحمان کے کتابچے ''ترتیبِ حج'' سے رہنمائی حاصل کر رہا تھا۔ مزدلفہ کے باب میں لکھا ہوا تھا:

''آج کی رات جس کو آپ مزدلفہ میں بسر کر رہے ہیں، بڑی فضیلت اور برکت والی رات ہے۔ اس رات میں انوارِ الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ مزدلفہ میں رات بسر کرنے والوں کو رحمتِ الٰہی اپنے دامن میں لے لیتی ہے۔ سونے کے لیے تو اور بہت سی راتیں ہیں۔ آج کی رات جو خوش قسمتی سے میسّر ہوگئی ہے، جاگ کر بسر کیجیے۔ کچھ دیر آرام بھی کریں اور اگر ضروری ہو تو سو بھی سکتے ہیں۔ نمازِ فجر تک ذکر اذکار کرنا مستحب ہے''۔

واقعی یہ رات خوش قسمتی سے میسّر آتی ہے۔ سیاہ آسمان پر روشن چاند اور چمکتے

ستارے ہم سب کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کالی سیاہ سڑک پر سفید احرام میں لپٹے ہوئے، زمین پر لیٹے ہوئے لاکھوں لوگوں نے زمین کو آسمان بنا دیا تھا۔ ہم سب ستارے تھے۔ مَیں بھی اپنے آپ کو ایک روشن ستارہ سمجھنے لگا تھا۔

چمکتی ہوئی رات

ہمارے پاؤں سڑک کی طرف تھے جہاں سے بڑی بڑی بسیں گزر رہی تھیں، جونہی کوئی بس آتی تو لگتا کہ ابھی ہمارے پیروں کے اوپر سے گزر جائے گی، لیکن ہم انجام سے بے پروا ہوکر وہیں پڑے رہے اور دِل ہی دِل میں دُعائیں مانگتے اور اپنے قسمت پر رشک کرتے رہے کہ آج مزدلفہ کے میدان میں انوارِ الٰہی کی بارش میں نہا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کب ہم چاروں کی آنکھ لگ گئی، آنکھ تب کھلی جب ایک پولیس اہل کار نے ہمیں جگایا، اُس نے ہمیں اپنا بوریا بستر کسی اور جگہ لے جانے کو کہا۔ اُس نے گزرتی ہوئی بسوں کو دیکھ کر کسی حادثے کے امکان کو بھانپ لیا تھا۔ پولیس اہل کار کے جگانے پر مجھے ذرا سا بھی دکھ نہیں ہوا ورنہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ہمیں نیند سے جگا دے تو بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ مَیں نے شکر ادا کیا کہ اس پولیس والے نے ہمیں خوابِ غفلت سے جگا دیا تھا۔ یہاں مجھے ممتاز شاعر اعجاز کنور راجا کا یہ شعر یاد آ گیا:

کب ایسی کہیں نیند ملی، ایسا بچھونا
مزدلفہ کی مٹی سے لپٹ کر مرا سونا

یہ رات کوئی سو کر گزارنے والی رات تھی؟ دس ذوالحجہ کا دن، طلوعِ ماہتاب کے وقت سے شروع ہو چکا تھا۔ حاجیوں کے لیے یہ دن سب سے زیادہ مصروفیت اور خوشی کا دن ہوتا ہے۔ یہی وہ دن ہے جب وہ بڑے شیطان کو زوال سے پہلے پہلے

سات کنکریاں مارنے کے بعد قربانی کا فرض ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد سر پر استرا پھرواتے یا بال ترشواتے ہیں، خواتین اپنی انگلی پر لپیٹ کر ڈیڑھ انچ کے برابر بال خود کاٹ لیتی ہیں یا اپنے محرم سے کٹواتی ہیں اور اس کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور عام لباس پہن لیا جاتا ہے گویا احرام کی ساری پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

سو ہم چاروں نے فجر کے وقت باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد قبلہ رُو ہو کر وقوف کیا، یعنی کھڑے ہو کر دُعائیں مانگیں۔ مزدلفہ میں وقوف کا یہ عمل واجب ہے۔ اگر یہ نہ کیا جائے تو دم واجب ہو جاتا ہے۔

بڑے شیطان کی سات کنکریاں

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا مزدلفہ میں موجود تمام حاجی نماز فجر ادا کرنے اور وقوف کے بعد منیٰ کی طرف روانہ ہونے کے لیے تیار تھے جہاں اُنھیں زوال سے پہلے پہلے بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا تھیں۔ تمام لوگ صبح سویرے تلبیہ پکارتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہوئے تو نہایت خواب ناک منظر تھا۔ مجھے تو یہ کسی اور ہی دنیا کا نظارہ لگ رہا تھا۔ ہم چاروں چلتے چلتے منیٰ میں اپنے مکتب یعنی خیمے کے قریب پہنچ گئے۔ یہ ہمارے لیے بہت اطمینان کی بات تھی۔ اپنے کندھوں پر لٹکائے ہوئے بیگ خیمے میں رکھے۔ کئی لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے اور چائے پی رہے تھے۔ ہمیں بھی مل گئی۔ چائے پیتے ہی جیسے ہم میں جان پڑ گئی۔ کچھ دیر خیمے میں آرام کرنے کے بعد ہم چاروں نے اپنے اپنے بیگ سے کنکریوں سے بھری بوتلیں نکالیں اور جمرات کی طرف چل پڑے۔ بڑے شیطان تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ چلنا پڑتا ہے۔ البتہ مہنگے حج پیکیج پر آنے والوں کے خیمے جمرات کے قریب ہوتے ہیں۔ گویا وہ شیطان کے ہمسائے ہوتے ہیں اس لیے وہ سب

سے پہلے سات کنکریاں مار کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ حج پر روانہ ہونے سے پہلے روزانہ پیدل چلنے کی مشق کریں۔ اس کا انھیں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لمبے لمبے فاصلے طے کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ کئی بوڑھے مردوں اور عورتوں کو میں نے جمرات کے راستے میں گرمی اور تھکن کی وجہ سے زمین پر گِرتے پڑتے دیکھا۔ لوگ ان کے چہروں پر پانی ڈالتے ہیں، اُنھیں اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، جن بوڑھوں کے ساتھ ان کی اولاد یا عزیز رشتے دار ہوتے ہیں وہ تو کسی نہ کسی طرح جمرات پہنچ جاتے ہیں، لیکن اکیلے آنے والے بوڑھے جہاں گرتے ہیں، وہیں پڑے رہتے ہیں۔ وہ اپنی کنکریاں کسی اور شخص کے ذریعے سے شیطان کو مارتے ہیں۔ کچھ یہ بھی نہیں کر پاتے۔ اب یہ میں نہیں کہ سکتا کہ اس کے لیے ان پر دم واجب ہوتا ہے یا نہیں؟

ہم بڑے شیطان کے سامنے پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ سیمنٹ اور بجری کی ایک دیوار ہے، چونکہ آج ہر حاجی کو کنکریاں مارنا تھیں اس لیے حاجیوں کی بھیڑ تھی۔ مرد و زن کی کوئی تمیز نہ تھی۔ یہاں ماضی میں کئی بار بھگدڑ مچنے سے ہزاروں لوگ جاں بحق ہو چکے ہیں اس لیے شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے میرے دِل میں بھی یہ خدشہ موجود تھا کہ کہیں آج بھی بھگدڑ نہ مچ جائے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس سال سعودی حکومت نے نہایت عمدہ انتظامات کیے تھے۔ یہاں پہنچنے کا راستہ الگ تھا اور باہر نکلنے کا راستہ الگ تھا گویا ون وے ٹریفک تھی۔ یہاں حادثہ تب ہوتا ہے جب ایک راستے پر آنے اور جانے والے حاجی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

کئی لوگ اپنی لاعلمی کے باعث شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے تلبیہ پکارتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے۔ کنکریاں مارتے ہوئے بسم اللہ اکبر اللہ اکبر کہنا چاہیے۔

اگر یہ نہ کہا جائے تو دم واجب ہو جاتا ہے۔ہمارے کئی پاکستانی بھائی شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے غصے کے جذبات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔کئی لوگ اپنی سات کنکریاں مارنے کے بعد جوش میں آ کر زمین پر پڑی ہوئی کنکریاں دوبارہ اُٹھا کر شیطان کو مارنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں عمل غلط ہیں۔کنکریاں مارتے ہوئے بھی ہم حالت احرام میں ہوتے ہیں اِس لیے غصہ حرام ہوتا ہے۔بعض لوگ شیطان کو کنکریاں اتنا زور سے مارتے ہیں کہ وہ واپس ان کی طرف پلٹ آتی ہیں۔

اپنے اندر کے شیطان کو شرم سار آج کر

d

وہ بھی یہی سمجھی تھیں کہ شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے شاید میری آنکھ ضائع ہو گئی ہے۔تینوں نے حیرت اور خوف کے ملے جلے اظہار کے لیے ہاتھ اپنے اپنے کھلے منہ پر رکھ لیے۔ہم نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔اب وہ مجھ پر پانی کی پھوار نہیں پھینک رہی تھیں لیکن اب بھی پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔مَیں نے ان کی حیرت اور خوف ختم کرنے کے لیے اپنی عینک اُتاری اور چہرہ ان کی طرف کر دیا۔

مالِ غنیمت

بڑے شیطان کو کنکریاں مارنے کے بعد لوگوں کے ہجوم کے ساتھ ہم آگے بڑھ گئے۔ راستا خود ہمارا راہ نما تھا۔ کہیں کوئی یوٹرن نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو رکاوٹیں لگا کر بند کر دیا گیا تھا اور پولیس اہل کار بھی کھڑے تھے تاکہ کوئی حاجی اِن رکاوٹوں کو پھلانگ کر دوسری طرف نہ چلا جائے۔ واپسی کا راستا بہت طویل تھا۔ اپنے مکتب میں پہنچے۔ ہمارے دوسرے ساتھی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اب قربانی کی باری تھی۔ قربانی کے پیسے ہمارے مکتب کے انچارج طالب حسین صاحب کے پاس تھے اور وہ ہم سب کی طرف سے قربانی کرنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ جب قربانی ہو جائے گی تو وہ ہمیں فون پر اطلاع دے دیں گے۔ تمام حاجی اپنے اپنے فون تھامے، طالب صاحب کی کال کا انتظار کر رہے تھے۔ بالآخر دو گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد ان کی طرف سے اطلاع آ گئی کہ تمام حاجیوں کی طرف سے قربانی کر دی گئی ہے اور اب سب لوگ اپنے سروں پر اُسترا پھروا سکتے ہیں۔ ہم چاروں، یعنی شکیل، بلال اور الطاف نے اپنا اپنا سامان کندھے پر رکھا اور منیٰ سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑے۔ چند قدم چلے تو ایک جگہ چھتریوں، گدوں، چٹائیوں، بائیسکلوں، پانی کی بوتلوں، عینکوں، بیلٹوں، ٹوپیوں اور جوتوں کا ایک ڈھیر دکھائی دیا۔ یہ وہ سامان تھا جو حاجی صاحبان اپنی

آسانی کے لیے راستے ہی میں پھینک دیتے ہیں اور بلدیہ حکام یہ سب کچھ ایک جگہ جمع کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہاں موجود اہل کار حاجیوں کو بُلا بُلا کر مالِ غنیمت سے اپنی پسند اور ضرورت کا سامان اٹھانے کی دعوت دے رہے تھے۔ حاجیوں کے لیے اب یہ سارا سامان غیر ضروری تھا۔ البتہ مقامی لوگ جو کسی طرح وہاں آ گئے تھے، اپنی اپنی ضرورت کے مطابق وہاں سے سامان اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔ بچوں کی بہت سی بائیسکلیں بھی پڑی تھیں۔ میرا جی للچایا کہ ایک آدھ بائیسکل اُٹھا لوں، لیکن یہ سوچ کر اپنی خواہش کو عملی شکل نہ دے پایا کہ ائر لائن والے بائیسکل کی قیمت سے زیادہ، کرایہ مانگ لیں گے۔

احرام سے آزادی

واپسی پر بھی بہت سے بوڑھے، ضعیف اور کمزور حاجی گرم سڑک پر گرے دکھائی دیے۔ عورتیں اور بچے تھک کر بار بار بیٹھ جاتے، لیکن سعودی پولیس اہل کار انھیں زبردستی اُٹھا دیتے۔ سعودی پولیس اہل کار بوڑھوں پر رحم کرتے ہیں نہ عورتوں پر، سب کو زبردستی اُٹھاتے ہیں اور چلتے رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ راستہ مسدود ہو جاتا ہے، لیکن ان کی دوعملی دیکھیے کہ حبشی عورتیں اپنے بچوں کو تپتی زمین پر لٹا کر بھیک مانگتی نظر آتی ہیں، اُنھیں ہرگز نہیں اُٹھاتے۔ ممکن ہے کہ یہاں بیٹھنے کے لیے یہ عورتیں پولیس والوں کو بھتا دیتی ہوں۔ اِن گداگر خواتین کی خوب چاندی ہوتی ہے۔ ہر آدمی انھیں کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔

تھوڑا سا چلے تو ایک جگہ نائیوں کی بہت سی دکانیں دکھائی دیں۔ نائی کم تھے، حاجی زیادہ۔ اس لیے اُسترا پھروانے کے منہ مانگے دام مانگے جا رہے تھے، لیکن ہم چاروں نے پاکستانی ہونے کا ثبوت یوں دیا کہ کئی نائیوں سے سودے بازی

کی۔ آخر دس دس ریال میں بات طے ہو گئی۔ ٹنڈ کرانے کے بعد ہم احرام کی پابندیوں سے مکمل طور پر آزاد ہو چکے تھے۔ احرام کھول سکتے تھے، لیکن ہمارا سامان عزیزیہ میں ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ امریکن سسٹم کے تحت ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور ہوٹل پہنچ گئے۔ غسل کیا اور نئے کپڑے پہن لیے جو میں نے ایک مغسلہ یعنی لانڈری شاپ سے دھلوا کر رکھے ہوئے تھے۔

طوافِ زیارت

نئے کپڑے پہننے کے بعد ہم چاروں طوافِ زیارت کے لیے خانہ کعبہ پہنچے۔ طوافِ زیارت حج کا فرض رُکن ہے۔ طوافِ زیارت کرنے کے بعد حاجی کے لیے اس کی بیوی دوبارہ حلال ہو جاتی ہے۔ طوافِ زیارت سے پہلے کوئی حاجی اپنی بیوی کو شہوت کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے نہ چھو سکتا ہے۔

طوافِ زیارت کا عمل عمرے کے طواف ہی کی طرح ہوتا ہے فرق بس یہ ہے کہ اس میں اضطباع یعنی دائیں کندھے کو ننگا نہیں کیا جاتا، کیونکہ آپ احرام کھول چکے ہوتے ہیں۔ البتہ پہلے تین چکروں میں تھوڑا اکڑ کر چلنا ہوگا، جسے رمل کہتے ہیں۔ طواف کے سات چکر پورے کرنے کے بعد مقامِ ابراہیم کے قریب دو رکعت واجب الطواف ادا کرتے ہیں۔ سو ہم چاروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ طواف کے فرائض مکمل ہونے کے بعد آبِ زم زم پیا۔

کچھ لوگ اس طواف کے بعد صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتے، لیکن ہم نے سعی بھی کی۔ یہ سعی فرض نہیں البتہ واجب ہے۔ یہاں ایک بار پھر بتا دوں کہ میں ابھی تک اپنی ایک آنکھ والی عینک لگائے ہوئے تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ میں نے دو تین ٹشو پیپر فولڈ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ لوگ میری طرف رحم کی نگاہ سے

دیکھتے۔ کئی ایک نے پوچھا بھی کہ یہ کیا ہوا؟ بیش تر لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ منیٰ، عرفات، مزدلفہ یا جمرات میں شاید میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے اور میری آنکھ چلی گئی ہے، لیکن جب مَیں نے اُنھیں عینک ٹوٹنے کا بتاتا تو وہ الحمدللہ کہتے اور آگے بڑھ جاتے۔

شرارتی لڑکیاں

جمرات سے واپسی کے سفر میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہم چاروں یعنی میں، شکیل، بلاول اور الطاف خوش گپیاں کرتے ہوئے اپنے مکتب کی طرف آ رہے تھے تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی پیچھے سے بار بار میرے گنجے سر پر ٹھنڈے پانی کی پھوار پھینک رہا ہے۔ شدید گرمی کے موسم میں یہ پھوار مجھے اچھی لگ رہی تھی شکیل نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے بتایا کہ دو تین حبشی لڑکیاں ہیں جو شرارت کے موڈ میں ہیں۔ مَیں نے اپنی ٹوٹی ہوئی عینک لگا رکھی تھی۔ ایک شیشا سلامت تھا۔ دوسرا عرفات کے میدان میں کہیں گر گیا تھا سو نگاہ کا توازن برقرار رکھنے کے لیے میں نے ایک شیشے کی جگہ دو تین ٹشو پیپر فولڈ کر کے لگا رکھے تھے۔ میں نے جب اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ لڑکیاں یک دم خوف زدہ ہو گئیں۔ وہ بھی یہی سمجھی تھیں کہ شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے شاید میری آنکھ ضائع ہو گئی ہے۔ تینوں نے حیرت اور خوف کے ملے جلے اظہار کے لیے ہاتھ اپنے اپنے کھلے منہ پر رکھ لیے۔ ہم نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔ اب وہ مجھ پر پانی کی پھوار نہیں پھینک رہی تھیں لیکن اب بھی پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔ مَیں نے ان کی حیرت اور خوف ختم کرنے کے لیے اپنی عینک اُتاری اور چہرہ ان کی طرف کر دیا۔ وہ میری صحیح سلامت آنکھیں دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ خوشی سے اُن کے چہرے کھل

اُٹھے۔ مَیں نے دوبارہ اپنی ٹوٹی ہوئی عینک لگائی اور چل دیا۔ اب انھیں یقین ہو
چکا تھا کہ مَیں بالکل تن درست ہوں۔ چنانچہ جب تک ان کی بوتل میں پانی رہا وہ
مجھ پر بھی اور میرے ساتھیوں پر آبی حملے کرتی رہیں۔ دراصل وہاں کچھ عرب
نوجوان اور پولیس اہل کار پانی سے بھری بوتلیں لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور وہ
ان کے ذریعے شدید گرمی میں جمرات سے واپس آنے والے حاجیوں کے سروں
پر ٹھنڈے پانی کی پھوار مارتے ہیں۔ ان لڑکیوں کے ہاتھ ایسی ہی کوئی بوتل لگ
گئی تھی اور وہ اس کا سارا پانی ہم غریبوں پر استعمال کرنا چاہتی تھیں۔

پانچ سو ریال کا نسخہ

طوافِ زیارت کے بعد مَیں کچھ دیر کے لیے ہوٹل کے کمرے میں آ گیا۔ کھانا
کھایا۔ چائے پی اور نئی عینک بنوانے کے لیے بازار کی طرف چل پڑا۔ عینکیں
بنانے اور فروخت کرنے والوں کی دکانیں جلد ہی مجھے دکھائی دے گئیں، لیکن کوئی
بھی دکان دار ماہرِ امراضِ چشم کے معائنے کے بغیر عینک بنانے کو تیار نہ تھا۔ جب
مَیں نے پوچھا کہ آپ کے ماہرینِ امراضِ چشم کہاں ہیں؟ تو بولے کہ سب حج اور
عیدالاضحیٰ کی تعطیلات پر ہیں۔ مَیں نے اپنی معلومات کے لیے نظر کے معائنے اور
عینک بنوانے کا معاوضہ اور فریم کی قیمت پوچھی تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ یہ
پانچ سو ریال کا نسخہ تھا۔ سو مَیں نے طے کر لیا کہ باقی دن بھی اسی ایک شیشے والی
عینک کے ساتھ ہی گزار لوں گا۔

مایوس ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو کراچی سے آیا ہوا ایک نوجوان حاجی مل
گیا۔ اُس نے بھی میری عینک دیکھ کر ماجرا پوچھا۔ مَیں نے بتا دیا تو اُس نے اپنی
عینک اُتار کر مجھے دی اور بولا: ''یہ لگا کر دیکھیے، ٹھیک ہے یا نہیں؟'' مَیں نے اُس

کی عینک لگائی تو اس کے اور میرے نمبر میں بس رتی برابر فرق تھا۔ اُس کی عینک
سے مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے اُسی وقت اپنے کمرے میں لے گیا اور
بیگ سے نکال کر اپنی دوسری عینک مجھے دے دی۔ قربانی کے دن ایثار کا یہ واقعہ
مَیں شاید ساری عمر نہ بھلا سکوں۔

مَیں نے جدّے میں موجود اپنے دردمند اور وضع دار دوست ریحان کو عینک
ٹوٹنے کے بارے میں بتایا تو بولا: ''یہ بتایئے کہ لاہور میں آپ کے گھر آپ
کی کوئی اضافی عینکیں موجود ہیں؟'' مَیں نے جواب اثبات میں دیا تو بولا: ''آپ
اِسی وقت لاہور اپنے گھر فون کریں کہ عینکیں پیک کر کے رکھیں''۔ سو مَیں نے ایسا
ہی کیا۔ ریحان نے اپنے کزن رمیز چشتی کو میرے گھر بھیجا۔ یہ وہی رمیز ہے جو
میرا شاگرد ہے اور عمر میں کم ہونے کے باوجود میرا مشیرِ خاص ہے۔ مشکل وقت
میں کام آتا ہے اور نہایت صائب مشورہ دیتا ہے۔ اِس بات کے تین دن بعد
ریحان کا فون آیا کہ اس کا ایک دوست جو حج اور عیدالاضحیٰ کی چھٹیاں گزارنے
کے لیے لاہور گیا ہوا تھا، آپ کی عینکیں لے آیا ہے۔ بعد میں ریحان میری عینکیں
خود جدّے سے مکّہ مکّرمہ لایا۔ یہ وہ عینکیں تھیں، جنھیں مَیں نے بے کار جان کر میز
کی دراز میں رکھ چھوڑا تھا، لیکن اب یہ بے کار عینکیں پا کر مَیں اقبال کا یہ مصرع بار
بار گنگنانے پر مجبور تھا:

کوئی بھی چیز نکمّی نہیں زمانے میں

طوافِ زیارت کا ایک واقعہ

طوافِ زیارت کی سعی کے دوران میں ایک عجب واقعہ پیش آیا۔ مَیں مروہ کی
پہاڑی کی طرف سے صفا کی جانب چلا تو میرے ساتھ ایک نوجوان جوڑا بھی سعی

کر رہا تھا۔ یہ دونوں چلتے ہوئے پنجابی میں بات چیت کر رہے تھے، جس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور پاکستانی ہیں۔ لڑکی پنجابی میں اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی ''میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ آپ نے تو مکتب میں ناشتا بھی کر لیا تھا اور کھانا بھی کھا لیا تھا۔ اب یہاں سے فارغ ہوتے ہی میں کھانا کھاؤں گی۔ ورنہ میں زمین پر ڈھیر ہو جاؤں گی''۔

اس کی یہ بات سُن کر میں اُن کی رفتار کے مطابق ان کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ میرے بیگ میں دو سینڈوچ تھے۔ لڑکے نے کہا: ''آبِ زم زم پی لو۔ بھوک مر جائے گی''۔ بات تو درست تھی کہ آبِ زم زم خالی پیٹ پیا جائے تو بھوک کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں آبِ زم زم سے بھرے کولروں کی طرف بڑھے تو میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ اس لڑکی کے شوہر نے ڈسپوزل ایبل گلاس اُٹھایا اور اُس میں آبِ زم زم بھرنے لگا۔ میں نے تیزی سے دونوں سینڈوچ اپنے بیگ سے نکالے اور اس لڑکی کے سامنے کر دیے۔ اُس نے جلدی سے سینڈوچ تھام لیے اور میرا شکریہ ادا کیا۔ سینڈوچ اسے تھماتے ہی میں وہاں سے فوراً چل دیا تھا۔ میں دراصل اسے احساس نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ میں نے اُس کی بات سُن لی تھی۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہے جو دِل کی آواز بھی سُن لیتا ہے۔ اُسی نے میرے دِل میں یہ بات ڈالی تھی کہ میں نے اپنے پاس موجود ضرورت سے زائد کھانا، اُس بھوکی لڑکی کے حوالے کر دیا۔

مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے

طوافِ زیارت کے بعد میں ایک بار پھر منیٰ کی خیمہ گاہ میں آ گیا، جہاں ابھی ہم سب حاجیوں کو دو دن مزید رہنا تھا۔ تمام لوگ احرام اُتار چکے تھے، اگلے روز

گیارہ ذوالحجہ تھی، زوال کے بعد تینوں شیطانوں کو باری باری سات کنکریاں مارنا تھیں، پہلے چھوٹے شیطان کو، پھر درمیانے شیطان کو اور آخر میں بڑے شیطان کو، کنکریوں سے بھری ہوئی بوتل میرے پاس تھی۔ کنکریاں مارنے کا عمل بظاہر معمولی ہے، لیکن خیمے سے جمرات جا کر تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنا نہایت صبر آزما اور مشکل کام ہے اور واجب بھی ہے۔ اگر کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنے خیمے میں آ کر اللہ اللہ کیجیے۔

حج کے پانچویں دن یعنی بارہ ذوالحجہ کو بھی یہی عمل دُہرایا۔ تینوں شیطانوں کو زوال کے بعد سات سات کنکریاں ماریں۔ یہ بھی واجب عمل ہے۔ کنکریاں مارنے کے بعد دوسرے حاجیوں کی طرح میں بھی اپنے خیمے میں آ گیا۔ عصر کی نماز خیمے ہی میں پڑھی۔ غروبِ آفتاب سے پہلے منیٰ کی حدود سے نکلنا ضروری ہے، چنانچہ میں پیدل ہی مکّہ مکرّمہ کے علاقے عزیزیہ میں واقع اپنے ہوٹل کی طرف پیدل چل پڑا۔ منیٰ سے عزیزیہ کی طرف جاتے ہوئے مجھے احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر یاد آ گیا

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے

دریا کیا، لوگوں کا ایک سمندر تھا جو مکّہ مکرّمہ کی طرف بہے چلا جا رہا تھا۔ منیٰ کی حدود سے نکلتے ہوئے جمرات سے گزر کر جب میں بیرونی راستے پر پہنچا تو اس کے دونوں طرف سعودی نوجوان (جو وہاں پانچ دن حاجیوں کی راہ نمائی اور خدمت کے لیے موجود تھے) رخصت ہونے والے تمام حاجیوں کو پُرجوش نعرے لگا کر الوداع کر رہے تھے۔ بہت سوں نے اپنے ہاتھوں میں پانی سے بھری بوتلیں تھام رکھی تھیں جن سے وہ شدید گرمی سے پریشان حاجیوں پر چھڑکاؤ کر رہے

تھے۔اس راستے پر سعودی حکومت نے آہنی کھمبوں کے ذریعے بھی مصنوعی بارش کا اہتمام کر رکھا تھا،جس سے درجہ حرارت بہت نیچے آ گیا تھا۔ بہت سے لوگ حاجیوں میں کھانے پینے کا سامان تقسیم کر رہے تھے۔کہیں بریانی کے پیکٹ تقسیم ہو رہے تھے تو کہیں سافٹ ڈرنک کے ٹن پیک اور جوس کی بوتلیں بانٹی جا رہی تھی۔کھجوروں کے ایک ایک کلو کے تیار پیکٹ بھی تقسیم کیے جا رہے تھے۔عام طور پر اہلِ مکّہ کے بارے میں تاثر پایا جاتا ہے کہ بہت سخت دِل واقع ہوئے ہیں لیکن حج کے پانچ دِنوں میں ان کے اندر انصارِ مدینہ کا سا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔وہ اللہ کے مہمانوں کو اپنا مہمان بنا لیتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ منیٰ جاتے ہوئے ہر شخص کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی،لیکن اب منیٰ سے رخصت ہوتے ہوئے ہر حاجی مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ہر ایک کا حج خوش اسلوبی سے ادا ہو گیا تھا، جو پانچ دن پہلے عازمینِ حج کہلاتے تھے اب حاجی ہو گئے تھے۔مَیں بھی انھی میں سے ایک تھا۔

عزیزیہ کی طرف جاتے ہوئے عجیب وغریب خیالات میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔سوچ رہا تھا کہ آج مَیں اللہ تعالیٰ کے گھر سے ایک معصوم بچے کی طرح پاک صاف ہوکر جا رہا ہوں۔کیا پاکستان جا کر بھی مَیں ایسا ہی رہوں گا؟ ایک چلی ہوئی گاڑی کے انجن کی اوور ہالنگ کرانے اور نیا سپیڈو میٹر لگوانے کے بعد میٹر دوبارہ چلتا ہے۔اور اس کے اوپر نئی ریڈنگ آ جاتی ہے۔مَیں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا مَیں اب ہمیشہ زیرو میٹر رہوں گا یا گاڑی کی طرح دوبارہ زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر چلنا شروع کر دوں گا؟ اور نئی ریڈنگ دینے لگوں گا۔کیا مَیں اپنے حج کو محفوظ رکھ سکوں گا؟ پھر دِل جواب دیتا کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔فرشتہ تو ہے نہیں کہ ہمیشہ پاک صاف رہے۔ہم تو غلطیوں سے بچنے کی کوشش ہی کر سکتے

ہیں۔بعض اوقات ہمارا غلط اور درست کا معیار ہم سے غلطیاں کروا دیتا ہے۔ہم جسے درست سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ وہ اللہ کی نظر میں غلط ہو اور جس بات کو ہم غلط سمجھ رہے ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ اللہ کی نظر میں مستحسن ہوتی ہو۔

گناہ گار کے آنسو قبول ہوتے ہیں

e

سعودی بچے نہایت ہوشیار اور بااعتماد نظر آتے ہیں۔ دکان دار چونکہ ہندوستانی، بنگلہ دیشی اور پاکستانی ہوتے ہیں اس لیے وہ عربی زبان میں ان پر رعب جھاڑتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نہاں خانہ ء دل میں کہیں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ وہ آقا ہیں اور یہ لوگ ان کی رعایا ہیں اور یہ نوکری یا کاروبار کرنے کے لیے نہیں بلکہ عربوں کی خدمت کے لیے سعودی عرب میں آئے ہوئے ہیں۔

خانہ کعبہ کی مقناطیسیت

پندرہ ستمبر کی صبح سو کر اٹھا تو دل نہایت پُرسکون تھا۔ جس کام کے لیے میں حجازِ مقدس آیا تھا وہ ہو گیا تھا۔ مناسکِ حج سے فرصت پانے کے بعد ہر حاجی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر واپس پہنچ جائے۔ مہنگے حج پیکیج والے حاجی صاحبان تو حج کرتے ہی اپنے وطن لوٹ جاتے ہیں لیکن ہم جیسے لوگ اپنے حج آرگنائزر کی دی ہوئی تاریخ ہی کو واپس جاتے ہیں۔ میری واپسی اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہونا تھی۔ گویا مجھے ابھی تین ہفتے مزید مکّہ مکّرمہ میں رہنا تھا۔ میری سیلانی طبیعت کے لیے یہ تاخیر، باعثِ مسرّت تھی۔ میں مکّہ مکّرمہ کے ذرّے ذرّے کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں پھر یہاں آنے کا موقع ملتا ہے یا نہیں؟ خانہ کعبہ کی مقناطیسیت بھی آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ خانہ کعبہ اپنے قریب آنے والوں کو دور جانے ہی نہیں دیتا۔ کہتا ہے بس مجھی سے چپکے رہو، لپٹے رہو۔ اپنے کمرے میں، بستر پر دراز تھا۔ پتا نہیں کب یہ شعر سرزد ہو گئے۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ پاس ہی پڑے کاغذ پر میں نے لکھ بھی لیے تھے۔ شاید اسی کو آمد کہتے ہیں۔ شعر ہو بھی گئے اور پتا بھی نہیں چلا۔

گناہ گار کے آنسو قبول ہوتے ہیں
معافیوں کے بھلا کب اصول ہوتے ہیں

دِلوں میں روشنی ہوتی ہے، جاں مہکتی ہے
ستارے جتنے ہوں، اُتنے ہی پھول ہوتے ہیں

یہاں خسارے کا امکان ہی نہیں کوئی
لگاؤ ایک تو دُہرے وصول ہوتے ہیں

یہاں تو وہ بھی سرافراز ہی نظر آئے
جو پاک بازوں کے قدموں کی دُھول ہوتے ہیں

عرب کے دشت سے آتی ہے باس پھولوں کی
اگرچہ دشت میں خار و ببول ہوتے ہیں

گناہ اپنے ہمیں یاد ہی نہیں رہتے
گناہ پہلی محبت کی بھول ہوتے ہیں

اسی لیے تو بھٹکتے نہیں ہیں ہم ناصر
ہمارے ساتھ ہمارے رسولؐ ہوتے ہیں

اپنے ہی کہے ہوئے شعر دوبارہ پڑھے تو مجھے لگا کہ یہ میں نے نہیں کہے، کسی اور نے کہے ہیں۔ جس نے لاکھوں کروڑوں لوگوں میں سے چُن کر مجھے اپنے گھر بلایا تھا، یہ اسی نے مجھے عطا کیے تھے۔

خدمت کا لُطف

خیال کا یہ سلسلہ تب ٹوٹا جب ریحان کا فون آیا۔ ریحان جدہ کے بہت بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ حج کے دنوں میں، وہ پاکستان

سے آنے والے اپنے شناسا حاجیوں کی بے لوث خدمت کرتا نظر آتا ہے۔ میں نے فون آن کیا تو بولا: ''فیصل آباد سے آنے والی ایک خاتون کی طبیعت ناساز ہے۔ میں انھیں اپنے ساتھ لے کر آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ آپ کے ہوٹل کے قریب ہی پاکستان حج میڈیکل مشن ہے۔ وہاں ان کا چیک اپ کرانا ہے''۔

خانہ کعبہ جا کر عبادت کرنے کی قیمت اور اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے لیکن انسانوں کی خدمت کرنے کا اپنا ہی لطف ہے۔ میں تیار ہو کر نیچے سڑک پر آ گیا۔ ریحان کچھ ہی دیر میں مریضہ کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ پاکستان حج میڈیکل مشن کے لیے وزارتِ مذہبی امور نے ایک بہت بڑی عمارت غالباً کرائے پر حاصل کر رکھی ہے۔ یہ اچھا بھلا ہسپتال ہے۔ یہ ہسپتال حج کے پانچ دنوں میں خالی ہو جاتا ہے، کیونکہ یہاں آنے والا محکمہ صحت کا سارا عملہ بھی حج کے لیے منیٰ روانہ ہو جاتا ہے۔ البتہ ضروری دوائیں اور سامان ڈاکٹر صاحبان اپنے ساتھ منیٰ لے جاتے ہیں تاکہ بیمار ہو جانے والے حاجی صاحبان کو فوری طور پر ابتدائی طبی امداد دی جا سکے۔ حج کے پانچ دنوں سے پہلے اور حج کے بعد دو تین ہفتے تک یہ ہسپتال آباد رہتا ہے۔ سارا عملہ پاکستانی ہوتا ہے۔ خدمت کے جذبے سے سرشار لوگوں کو ہر سال محکمہ صحت سے چنا جاتا ہے اور یہاں بھیجا جاتا ہے۔ ریحان کے ساتھ آنے والی مریضہ کی حالت کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھی۔ وہاں موجود ڈاکٹر نے ہنگامی بنیادوں پر ان کا معائنہ کیا۔ ٹیسٹ کروائے۔ ایکسرے اُتروائے۔ ایکسرے خشک کرنے کے لیے پیرا میڈیکل اسٹاف نے ائر کنڈیشنر کی ہَوا کو استعمال کیا۔ دوائیں مفت دی گئیں۔ اس کے باوجود مریضہ علاج سے مطمئن نہ تھیں۔ وہ دراصل کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تعلیم یافتہ بھی تھیں اس لیے توقع رکھتی تھیں کہ ان کا علاج اسی طرح کیا جائے جس طرح پاکستان کے

پرائیویٹ ہسپتال میں ہوتا رہا تھا لیکن اس وقت وہ ایک فلاحی ادارے میں تھیں۔ ویسے بھی یہ ایک عارضی علاج گاہ تھی۔ یہاں مریضوں کی صرف اسی قدر دیکھ بھال کی جاتی ہے کہ وہ حج ادا کرنے اور پاکستان واپس جانے کے قابل ہوسکیں۔

سویلین اور فوجی کھانا

اسی ہسپتال میں آؤٹ ڈور مریضوں کی لمبی قطار میں مجھے ایک آشنا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ پروفیسر عارف انجم تھے۔ گورنمنٹ کالج ماڈل ٹاؤن لاہور میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ میرے علم میں تھا کہ وہ حج کے لیے آئے ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں پتا تھا کہ ان سے یوں اچانک ملاقات ہو جائے گی۔ بہت سے دوسرے حاجیوں کی طرح ان کا بھی گلا خراب ہوگیا تھا۔ انھوں نے وعدہ لیا کہ میں مغرب کی نماز سے پہلے کلاک ٹاور کے نیچے اُن سے ملوں گا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا اور آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہوگیا۔ دوپہر کے وقت ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گیا تو وہاں جلیل عالی صاحب کا بیٹا میجر میزان جلیل بھی اپنے دیگر فوجی ڈاکٹر دوستوں کے ساتھ کھانے کا آرڈر دے کر کھانا آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دال کا آرڈر دیا تھا۔ اتنے میں ایک بیرا آیا اور میجر میزان جلیل کے سامنے بریانی کی بڑی بڑی پلیٹیں رکھ گیا۔ ہر پلیٹ میں آدھا چرغا بھی تھا۔ بیرا میرے سامنے دال رکھ کر گیا تو میجر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں نے کہا: ''میجر صاحب! میں سویلین کھانا کھاؤں گا''۔ بولے: ''سویلین کھانا کیسا ہوتا ہے؟'' میں نے اپنے سامنے دھری دال کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''ایسا ہوتا ہے سویلین کھانا''۔ پتا نہیں میجر میزان نے میرے بارے میں دل ہی دل میں کیا

سوچا ہوگا۔ شاید بلڈی سویلین بھی کہہ دیا ہو لیکن میں نہایت اطمینان سے اپنے سامنے دھرا کھانا کھانے لگا۔

حسین سحر کا سانحہء ارتحال

پاکستانی حاجیوں کو ہوٹل سے خانہ کعبہ تک لے جانے اور وہاں سے واپس لانے کے لیے وزارتِ مذہبی امور نے بہت سی بسیں کرائے پر حاصل کر رکھی ہوتی ہیں۔ انھی میں سے ایک بس میرے ہوٹل کے سامنے کھڑی ہوتی تھی اور ہر نماز سے پہلے یہ خانہ کعبہ کی طرف جاتی، جانے والوں کو وہاں اتار آتی اور واپس آنے والوں کو ساتھ لے آتی۔ ابتدائی دنوں میں مجھے اس بس کے بارے میں علم نہیں تھا اس لیے کئی بار ٹیکسی لے کر خانہ کعبہ پہنچا۔ میری طرح کئی پرائیویٹ حاجی اس بس کو آنے جانے کے لیے استعمال کرتے رہے۔

عصر کی نماز سے پہلے خانہ کعبہ پہنچا۔ باجماعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد شارع ابراہیم خلیل کی طرف جا نکلا۔ ایک جنرل سٹور سے جدّے سے چھپنے والا اخبار ''اردو نیوز'' خریدا۔ اس اخبار میں جہاں حج سے متعلق بہت سی خبریں چھپی ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔ ''پاکستان رائٹرز فورم کے سابق صدر، گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ کالج ملتان کے پرنسپل پروفیسر حسین سحر گزشتہ جمعرات کو ملتان میں انتقال کر گئے۔ ان کا شمار اپنے عہد کے ممتاز ماہرینِ تعلیم اور شعراء میں ہوتا تھا''۔

میرے لیے یہ ایک بڑی اور بُری خبر تھی۔ ''اردو نیوز'' میں خبر لگنے کا سبب یہ تھا کہ حسین سحر کئی برس ریاض اور جدے میں گزارنے کے بعد ملتان گئے تھے۔ سحر صاحب ایک نہایت دل نشیں شخصیت کے مالک تھے۔ جب میں 1985ء اور

1986ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج سول لائنز ملتان میں ایف اے کا طالب علم تھا تو سحر صاحب وہاں لیکچرار تھے۔ مجھے پڑھاتے تو نہیں تھے البتہ میں ان کے ٹیوٹوریل گروپ کا رُکن تھا۔ یوں مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے یہ دوشعران کی پہچان ہیں:

میں لہلہاتی شاخ کو سمجھا تھا زندگی
پتا گرا تو درسِ فنا دے گیا مجھے
میرے لیے تو سانس بھی لینا محال ہے
یہ کون زندگی کی دُعا دے گیا مجھے

اسی اخبار میں چھپنے والی ایک تصویر سے پتا چلا کہ صدر پاکستان ممنون حسین نے بھی اس برس حج ادا کیا۔

حج 2016ء پر ایک نظر

''اردو نیوز'' میں ایک سعودی سرکاری ادارے کی طرف سے چھپنے والی خبر کے مطابق اس برس 18 لاکھ 62 ہزار 909 افراد نے حج کی سعادت حاصل کی جن میں سے 71 فیصد بیرونِ ملک سے آئے تھے، 29 فیصد اندرونِ ملک سے۔ یہاں یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ اس سال ایرانی حاجی نہیں آئے یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ خود نہیں آئے یا انھیں سعودی حکومت نے روک دیا۔ البتہ اخبار میں ایرانی حجاج کرام کے لیے بنائے گئے پُرتعیش مگر خالی خیموں کی تصویریں دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خود ہی نہیں آئے ہوں گے۔ اگر سعودی حکومت نے منع کیا ہوتا تو ان کے لیے خیمے مخصوص نہ کیے جاتے۔

اعداد وشمار کے مطابق اس سال صرف سعودی عرب سے پانچ لاکھ سینتیس ہزار

پانچ سوسینتیس (537537) افراد نے حج کیا جن میں سے دو لاکھ سات ہزار چار سو پچیس (207425) غیر ملکی تھے۔ سعودی عرب سے پاکستانی حاجیوں کی تعداد بارہ ہزار دو سو اٹھاون (12258) تھی۔ ہندوستانی حاجیوں کی تعداد چھ ہزار آٹھ سو تہتر (6873) تھی۔ بنگلا دیشی حاجیوں کی تعداد تین ہزار ایک سو اٹھاون (3158) تھی۔ یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ اس سال سعودی عرب میں رہنے والے چار سو ستاسی (487) امریکی مسلمانوں نے بھی حج کی سعادت حاصل کی۔ اس برس حج سے پہلے اور حج کے دنوں میں تینتیس (33) عازمینِ حج کا مکّہ مکّرمہ اور مدینہ منّورہ میں قیام کے دوران میں انتقال ہو گیا جنھیں جنّت المعلیٰ اور جنّت البقیع میں دفن کیا گیا۔

خدمت کا نادر موقع

مغرب کی نماز سے پہلے، میں خانہ کعبہ کے باب عبدالعزیز کے سامنے پہنچ گیا جہاں پروفیسر عارف انجم میرے مُنتظِر تھے اور میں ان کا مُنتظَر۔ انھوں نے بتایا کہ حج سے پہلے انھیں عزیزیہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ حج کے بعد انھیں خانہ کعبہ کے قریب ہی واقع ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کمرا دیا گیا ہے۔ اصل میں ہُوا یہ کہ اس سال سعودی حکومت نے سکیورٹی خدشات کے پیش نظر بہت کم حاجیوں کو ویزے جاری کیے تھے اس لیے بیش تر چھوٹے بڑے ہوٹل خالی پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ دور دراز کے علاقوں میں واقع ہوٹلوں میں مقیم حاجیوں کو خانہ کعبہ کے قریب واقع ہوٹلوں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ عارف انجم کے ساتھ چائے کا کپ پینے کے بعد مغرب اور عشا کی نمازیں ادا کیں۔ عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد پروفیسر صاحب اپنے ہوٹل جانے کے بجائے مجھے اپنے ساتھ لے کر مطاف

میں پہنچ گئے جہاں ان کی بیگم صاحبہ ان کی منتظر تھیں۔ وہ وہیل چیئر پر تھیں۔ پروفیسر صاحب نے ان کی وہیل چیئر دھکیلنا شروع کی اور بولے: ''آپ ہمارے ساتھ ہمارے ہوٹل چلیں گے اور کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے''۔ سو میں ان کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ ان کا ہوٹل تھا تو قریب ہی لیکن راستا چڑھائی کا تھا۔ ان سے وہیل چیئر دھکیلی نہیں جا رہی تھی۔ وہاں کھڑے ایک عربی نوجوان سے انھوں نے وہیل چیئر دھکیلنے کا معاوضہ پوچھا، سو ریال کا سُن کر ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں بولا: ''جہاں تک آپ وہیل چیئر دھکیل سکتے ہیں، ٹھیک ہے اس کے بعد میرے حوالے کر دیجیے گا''۔ بولے: ''میں تو ابھی سے تھک گیا ہوں''۔ میرے اندر خدا جانے کہاں سے توانائی آ گئی تھی۔ چڑھائی کا راستا میں نے بہت آسانی سے طے کر لیا۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی ان کی طرح پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ جب میں ان کی وہیل چیئر دھکیل رہا تھا تو انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کل صبح انھیں وہیل چیئر پر طواف کرواؤں گا۔ وہیل چیئر پر طواف مطاف کی اوپر والی منزل پر ہوتا ہے اس لیے چکر بہت لمبا ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود میں نے انھیں طواف کروانے کی یقین دہانی کرا دی۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ ہو جائے گا۔ عبادت بھی کر لوں گا اور خدمت بھی۔

رات کا کھانا میں نے پروفیسر عارف اور ان کی بیگم صاحبہ کے ساتھ انھی کے ہوٹل میں کھایا۔ اس ہوٹل میں سارے حاجی پاکستانی تھے اور زیادہ تر لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ کھانا معیاری تھا۔ پروفیسر صاحب کی بیگم صاحبہ نے کہا کہ شام کا کھانا آپ ہر روز ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا حکم تھا کہ میں ہر روز خانہ کعبہ سے ان کے ہوٹل تک ان کی وہیل چیئر کھینچوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے نیکی کا نادر موقع عطا کیا تھا۔ اور میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

اس لیے ہامی بھر لی۔

اگلے دو تین دن میں اسی طرح عصر سے پہلے پہلے سرکاری سکیم کے حاجیوں کے لیے چلنے والی بس میں بیٹھ کر خانہ کعبہ پہنچ جاتا۔ پروفیسر عارف کے ساتھ چائے پیتا۔ مغرب اور عشا کی نماز ان کے ساتھ ادا کرتا، ان کی بیگم صاحبہ کی وہیل چیئر دھکیلتا، کھانا کھاتا اور واپس اپنے کمرے میں آ جاتا۔

سکول کھل گئے

حج ختم ہوئے چونکہ کئی دن گزر چکے تھے اس لیے بیش تر حاجی اپنے اپنے وطن روانہ ہو چکے تھے۔ پہلے جن سڑکوں پر غیر ملکی حاجی دکھائی دیتے تھے اب ان سڑکوں پر عرب لوگ بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ صبح سویرے چائے پینے یا ناشتا کرنے کے لیے نکلتا تو سکول جاتے ہوئے بچے نظر آتے۔ حج اور عیدالاضحیٰ کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب سعودی عرب میں کم سن بچیوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ پہلے لڑکیوں کو دس یا بارہ سال کی عمر میں پہلی جماعت میں داخلہ دیا جاتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پانچویں یا چھٹی جماعت میں پہنچتے ہی ان کی شادی کر دی جاتی تھی یوں ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا۔

سعودی بچے نہایت ہوشیار اور بااعتماد نظر آتے ہیں۔ دکان دار چونکہ ہندوستانی، بنگلہ دیشی اور پاکستانی ہوتے ہیں اس لیے وہ عربی زبان میں ان پر رعب جھاڑتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نہاں خانہ ء دل میں کہیں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ وہ آقا ہیں اور یہ لوگ ان کی رعایا ہیں اور یہ نوکری یا کاروبار کرنے کے لیے نہیں بلکہ عربوں کی خدمت کے لیے سعودی عرب میں آئے ہوئے ہیں۔

سعودی عرب میں سکول نمازِ فجر کے بعد صبح کے تقریباً چھ بجے کھلتے ہیں اور نمازِ ظہر سے پہلے پہلے یعنی بارہ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ چھٹی کے وقت میں جان بوجھ کر اپنے کمرے سے نکل کر سڑک پر آ جاتا اور سعودی بچوں کو گھر جاتے دیکھتا۔ کبھی اس سٹور میں بیٹھ کر چائے پینے لگتا جہاں سے یہ بچے جوس کی بوتلیں اور کولڈ ڈرنک کے ٹن پیک خریدتے اور زمین پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے۔ میں چپکے چپکے ان کی تصویریں اور وڈیو بناتا۔ ان بچوں کا اعتماد دیکھیے کہ جب انھیں پتا چل جاتا کہ میں ان کی تصویر یا وڈیو بنا رہا ہوں تو یہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیتے۔ گُھور کر بھی دیکھتے۔ مجھے ان بچوں سے کبھی کبھی ڈر بھی لگتا۔ پتا نہیں کِس نمبر پر فون کر دیں اور پولیس کو بُلا لیں۔ مجھے تو نہیں پتا تھا کہ وہاں تصویریں اور وڈیو بنانے سے متعلق کون سے قوانین ہیں؟ سعودی عرب میں جرم چھوٹا ہو یا بڑا، آپ کو سزا مل کر رہتی ہے۔

اے سی چل رہا ہے

سعودی عرب میں بھی دنیا بھر کی طرح سڑکوں کے دونوں طرف فٹ پاتھ بنائے گئے ہیں لیکن یہ گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں تقریباً ہر آدمی کے پاس اپنی گاڑی ہے اس لیے ان فٹ پاتھوں کے اصل استعمال کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ فٹ پاتھوں کا سڑک کی طرف والا حصہ سڑک کی طرف اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سعودی حکومت خود چاہتی ہے کہ فٹ پاتھ کے اوپر گاڑی پارک کر دی جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔

میرے ہوٹل کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا اسٹور تھا۔ جس میں گھریلو استعمال کی

ہر چیز میسّر تھی۔ یہ اسٹور ائر کنڈیشنڈ تھا لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اس کے اندر ایک بہت بڑا تندور تھا جہاں ہر وقت تازہ ڈبل روٹیاں، بسکٹ اور کیک تیار ہو رہے ہوتے تھے۔ اس تندور کی حدّت کے باوجود، اے سی کی کولنگ کم نہیں ہوتی تھی۔ یہ معجزہ بھی سعودی عرب ہی میں دیکھا کہ ہوٹل میں اے سی چل رہا ہے اور ہوٹل کا مرکزی دروازہ کھلا ہے، آپ اس کے سامنے کھڑے ہو جایئے اور ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لیجیے۔ ہمارے ہاں اے سی چل رہا ہو تو بار بار ایک ہی آواز سننے میں آتی ہے: ’’دروازہ بند کر دو، اے سی چل رہا ہے‘‘۔ سعودی عرب میں یہ آواز کہیں سنائی نہیں دی۔

خیرات بھی مل جائے تو انکار نہ کرنا

f

جس طرف طواف ایک عظیم عبادت ہے، مجھے لگتا ہے کہ مسجد الحرام کے اردگرد گھومنا پھرنا بھی ایک عبادت ہے۔ سو میں فہد گیٹ سے باہر نکلا اور ادھر ادھر گھوم کر دنیا بھر سے آئے ہوئے حاجی صاحبان کے چہرے پڑھنے لگا۔ ذرا سی تھکاوٹ کا احساس ہوا تو کلاک ٹاور کے نچلے حصے میں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ مجھے لگا کہ میں فقیرِ حرم ہوں۔ یہاں بیٹھ کر میں پاکستان میں موجود اپنے والدین، بچوں، اہلیہ، رشتے داروں، دوستوں اور رفقائے کار کے لیے خیر کا طلب گار تھا۔

مسجد خدیجہ بنت خویلدؓ

دوسرے حاجی صاحبان کی طرح میری خواہش بھی یہی ہوتی تھی کہ ہر نماز مسجد الحرام میں عین خانہ کعبہ کے سامنے پڑھی جائے لیکن میرا قیام چونکہ حرم سے کچھ دور تھا اس لیے فجر کی نماز کبھی اپنے ہوٹل کے ساتھ ہی واقع مسجدِ خدیجہ بنت خویلدؓ میں ادا کرتا اور کبھی بس کے ذریعے مسجد الحرام جا پہنچتا۔ مسجد خدیجہ بنت خویلدؓ سعودی عرب کے حساب سے ایک چھوٹی سی مسجد ہے لیکن ہماری پاکستانی مسجدوں کے مقابلے میں خاصی بڑی ہے۔ نہایت عمدہ قالین بچھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف فریج پڑا ہوا ہے جس میں نمازیوں کے لیے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ کھجوریں بھی ہر وقت میسّر رہتی ہیں۔ جتنی چاہے کھالیں اور جتنی چاہیں ساتھ لے جائیں۔ مجھے اس مسجد میں فجر کی نماز کے علاوہ بھی کئی نمازیں پڑھنے کا موقع ملا اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد میں جب بھی باہر آیا یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ عین دروازے کے سامنے ایک چھوٹا عارضی بازار سج جاتا اور حبشی عورتیں خمسہ خمسہ یا عشرہ عشرہ کی آوازیں لگا کر نمازیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتیں۔ خمسہ کا مطلب ہے پانچ اور عشرہ کا مطلب ہے دس یعنی ہر چیز پانچ یا دس ریال میں میسّر تھی۔ اس عارضی بازار پر نمازی یوں یلغار کرتے کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا مال بک جاتا۔ میں نے بھی اس عارضی بازار سے کئی چیزیں صرف یہ سوچ کر خرید لیں کہ

چلو یہ عورتیں رزقِ حلال تو کما رہی ہیں ناں! بھیک تو نہیں مانگ رہیں۔ ویسے بھی انھیں دیکھ کر مجھے ہر روز احساس ہوتا تھا کہ انھیں ہمارے آخری پیغمبر کی پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور ہے۔ وہی حضرت خدیجہؓ جو مکّہ مکّرمہ کی ایک معزّز اور عالی نسب خاتون تھیں۔ عرب کے قبیلے قریش سے تعلق تھا۔ جو ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث اپنے جاننے والوں میں طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ وہی حضرت خدیجہؓ جنھوں نے حضور پاکؐ کو اپنا مالِ تجارت دے کر بیرونِ ملک بھیجا اور آپؐ نے اپنی دیانت، صداقت، محنت اور عمدہ اخلاق سے حضرت خدیجہؓ کی تجارت کو کئی گناہ بڑھایا۔ آپؐ کے اوصاف کو دیکھتے ہوئے خود حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو شادی کی پیش کش کی، جو آپؐ نے قبول کی اور آپؐ نے ان سے شادی کا فیصلہ کر کے بیواؤں کا اصل مقام متعین کر دیا۔

جس طرح حضرت خدیجہؓ کا کاروبار خوب چمکا تھا، اسی طرح مسجد خدیجہ بنت خویلدؓ کے باہر، سامان بیچنے والی خواتین کی بھی ہر روز خوب چاندی ہوتی تھی۔ یہ بات بھی لائقِ ذکر ہے کہ میں نے اس مسجد کے باہر مردوں کو سامان بیچتے نہیں دیکھا۔

لاہور کا چالاک بابا

مسجد خدیجہ بنت خویلدؓ میں نماز فجر ادا کرنے کے بعد میں قریب ہی واقع ایک چھوٹے سے فوڈ سٹور سے دو ریال میں ایک چھوٹا سا شوارما (جسے عربی میں سمولی کہا جاتا ہے) اور چائے کا ایک کپ خریدتا۔ یہ مختصر سا ناشتا وہیں بیٹھ کر کرتا۔ اس فوڈ اسٹور کے ساتھ کئی بڑے سٹور تھے۔ مغربی طرز کے یہ سٹور دنیا بھر کی چیزوں سے اَٹے ہوئے تھے۔ جن کی ہر روز کی آمدنی بلاشبہ ہزاروں نہیں، لاکھوں ریال ہوگی۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے ہمیشہ دکھ ہوتا کہ ان سٹوروں کے باہر غریب عورتیں اپنے بچوں

کے ساتھ بھیک مانگنے کے لیے ہر وقت موجود ہوتیں۔ ایک دن عجیب منظر دیکھا جس نے مجھے سعودی معاشرے کی ایک جھلک دکھا دی تھی۔ ایک کم سن حبشی بچہ سٹور کے باہر گری ہوئی مسور کی دال کے باریک دانے اپنی نازک اور ننھی منی انگلیوں سے سمیٹ کر ایک لفافے میں جمع کر رہا تھا۔ پتا نہیں یہ بھیک مانگنے کا کوئی انداز تھا یا واقعی حالات کا جبر تھا۔ مجھ سمیت جس نے بھی اس بچے کو مسور کی دال جمع کرتے دیکھا اس نے اسے ایک ایک دو دو ریال ضرور دیے۔ اس بچے کو دیکھ کر مجھے لاہور کا ایک چالاک بابا یاد آ گیا۔ یہ بابا ایک بڑی سی پرات میں چنے کی چاٹ لاتا ہے اور جان بوجھ کر کسی ایسی جگہ چاٹ زمین پر گرا دیتا ہے جہاں سے لوگوں کا گزر ہوتا ہے۔ اس کی ساری چاٹ زمین پر گری دیکھ کر کوئی شخص رکتا ہے اور اسے ہزار دو ہزار روپے دے دیتا ہے۔ بابا زمین پر گری ہوئی چاٹ بظاہر روتے ہوئے اٹھاتا ہے، پرات میں ڈالتا ہے اور چل دیتا ہے۔ آدھ پون گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ اپنی چاٹ کو ایک بار پھر زمین پر گرا دیتا ہے اور اپنے مصنوعی آنسوؤں کی قیمت لگوا کر ہزار دو ہزار روپے دوبارہ جیب میں ڈالتا ہے اور چلتا بنتا ہے۔ بقول شخصے یہ چالاک بابا فوڈ اتھارٹی کے ڈائریکٹر جنرل نور الامین مینگل کو بھی چونا لگا چکا ہے۔ اس کی گری ہوئی چاٹ دیکھ کر مینگل صاحب نے بھی اسے دو ہزار روپے دے دیے تھے۔ لیکن غلطی ان سے یہ ہوئی کہ اس کی زمین پر گری ہوئی چاٹ ضائع نہیں کروائی۔ مینگل صاحب چلے گئے تو بابا جی نے اپنی ساری چاٹ زمین سے اٹھائی اور کسی اور کو بے وقوف بنانے کے لیے چل پڑا۔

”بہادر بچے“

ایک دن مسجد خدیجہ بنت خویلدؓ میں نمازِ فجر ادا کرنے اور ناشتا کرنے کے بعد

اپنے کمرے میں واپس آیا تو صبح سویرے اُجالا کا فون آ گیا۔ بولی: ''بابا: پتا ہے کل میری اکیڈمی میں کیا ہوا؟'' اس کے استفہامیہ اور استعجابیہ لہجے نے مجھے پریشان کر دیا۔ آپ پردیس میں ہوں اور بچوں سے متعلق کوئی بری خبر سننے کو ملے تو آپ کی جو کیفیت ہو سکتی ہے، اُجالا کے سوال نے مجھے اسی کیفیت سے دو چار کر دیا۔ اندیشوں اور خدشات کے ساتھ میں نے پوچھا: کیا ہوا؟ کہنے لگی: ''کل میری اردو کی ٹیچر نے آپ کی نظم ''بہادر بچے'' پڑھائی اور ساتھ ہی پوری کلاس سے میرے لیے تالیاں بھی بجوائیں۔'' اس کی بات سن کر میری جان میں جان آئی۔

واقعہ یہ ہے کہ 2014ء میں پشاور کے آرمی پبلک سکول میں دہشت گردی کی واردات ہوئی تو پنجاب حکومت نے محسوس کیا کہ طلبہ و طالبات میں خوف کی ایک لہر پیدا ہو گئی ہے۔ ان میں بہادری اور دلیری کے جذبات اور دہشت گردوں سے نمٹنے کا عزم پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پرائمری، مڈل اور میٹرک کی اردو کی کتابوں میں کچھ نئی نظمیں اور کہانیاں شامل کی جائیں۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے حکام نے شاعروں سے رابطہ کیا تو مجھے بھی یاد کیا۔ میں نے ایک نظم ''بہادر بچے'' کے عنوان سے لکھی اور بورڈ حکام کے حوالے کر دی۔ 2016ء میں یہ نظم دسویں جماعت کی اردو کی کتاب میں شامل کر دی گئی۔ اُجالا دسویں جماعت میں یہی کتاب پڑھ رہی تھی اس نے اپنی اردو کی ٹیچر کو بہت فخر سے بتا رکھا تھا کہ نصاب میں شامل نظم ''بہادر بچے'' اس کے بابا کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خود میرے لیے بھی ایک اعزاز ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں نصاب میں آنے کے لیے شاعروں کو مرنا پڑتا ہے اور مرنے کے بعد بھی دس بیس سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میری یہ نظم تا حال دسویں جماعت کی اردو کی کتاب میں شامل ہے لیجیے آپ بھی پڑھ لیجیے:

پاکستانی بچے ہیں ہم، امن سے اتنا پیار ہمیں
اپنے اندر کے دشمن سے لڑنا ہے اس بار ہمیں

دریا میں طغیانی ہے، منجدھار میں کشتی ٹھہری ہے
لیکن ہم نے سوچ لیا ہے، جانا ہے، اُس پار ہمیں

کلیاں دل کی کِھل جائیں گی، بادِ صبا اِٹھلائے گی
فصلِ بہار ہے آنے والی، دکھتے ہیں آثار ہمیں

صحنِ چمن کی مٹی کو ہم اپنے خون سے سینچیں گے
اس کا اِک اک ذرّہ آخر کرنا ہے گُل زار ہمیں

ہم آنکھوں میں سپنے لے کر آگے بڑھتے جائیں گے
موت سے ہم کو ڈر نہیں لگتا جینے سے ہے پیار ہمیں

منزل پر پہنچیں گے اک دن، وہیں قیام کریں گے ہم
روک نہیں سکتی ہے ناصر کوئی بھی دیوار ہمیں

پانی کی دو بوتلیں

اُجالا کے خوش کن فون نے میرے اندر اچانک ایک توانائی بھر دی۔ میں اٹھا، غسل کیا، کاندھے پر بیگ لٹکایا اور خانہ کعبہ کی طرف چل دیا۔ ابھی ظہر کی نماز کا وقت نہیں ہوا تھا۔ کعبے کا طواف کیا۔ صفا و مروہ کی سعی بھی کی۔ جس طرح طواف ایک عظیم عبادت ہے، مجھے لگتا ہے کہ مسجد الحرام کے اردگرد گھومنا پھرنا بھی ایک عبادت ہے۔ سو میں فہد گیٹ سے باہر نکلا اور ادھر ادھر گھوم کر دنیا بھر سے آئے

ہوئے حاجی صاحبان کے چہرے پڑھنے لگا۔ ذرا سی تھکاوٹ کا احساس ہوا تو
کلاک ٹاور کے نچلے حصے میں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ مجھے لگا کہ میں
فقیرِ حرم ہوں۔ یہاں بیٹھ کر میں پاکستان میں موجود اپنے والدین، بچوں، اہلیہ،
رشتے داروں، دوستوں اور رفقائے کار کے لیے خیر کا طلب گار تھا۔ کوئی خیرات بھی
دے دیتا تو شاید میں قبول کر لیتا۔ ابھی وہاں بیٹھے ہوئے مجھے چند لمحے ہی ہوئے
تھے کہ دو نہایت فربہ اندام پاکستانی خواتین، ہانپتے کانپتے میرے قریب آن
بیٹھیں۔ آبِ زم زم سے بھری ایک بوتل اس وقت میرے سامنے پڑی تھی جس
سے میں پانی پی چکا تھا انھوں نے اس بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ
پانی مل سکتا ہے؟'' میں نے کہا: ''نہیں'' میرے صاف جواب پر وہ خاصی حیران
ہوئیں لیکن جب میں نے اپنے ہینڈ بیگ سے نکال کر آبِ زم زم سے بھری ہوئی
دو چھوٹی بوتلیں ان کے سامنے رکھ دیں تو ان کی حیرت مزید بڑھ گئی۔ بسکٹ کا
ایک پیکٹ بھی انھیں دے دیا۔ دونوں پنجابی میں گفتگو کر رہی تھیں اس لیے مجھے
اپنائیت کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگا تھا۔

بن داؤد سپر سٹور

ان دونوں خواتین کو پرائیویسی دینے کے لیے میں اٹھا اور سامنے ہی نظر آنے
والے بہت بڑے سٹور بن داؤد میں جا گھسا۔ دراصل ایک دن پہلے میرے ایک
ساتھی نے مجھے بن داؤد کا ایک بروشر دیا تھا جس میں لکھا ہوا تھا کہ یہاں موبائل
فونز کی کلیرنس سیل لگی ہوئی ہے۔ میں اپنے بچوں کے لیے چار عدد موبائل فون
خریدنا چاہتا تھا۔ بن داؤد سٹور نہیں، پوری ایک دنیا ہے۔ یہ ویسا ہی سٹور ہے جس کا
ذکر بیگم اختر ریاض الدین نے امریکی ریاست ہوائی کے سفر نامے میں کیا ہے۔ وہ

لکھتی ہیں:
''سپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرزِ حیات کا
بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخّار ہے۔ جب سے یہ برروئے زمین،
برسرِ پیکار ہوا، ننھی ننھی دکانیں اور چھوٹے چھوٹے بساطی، پنساری دیوالیہ ہو گئے۔
یہ سپر مارکیٹ دس بازاروں کا مہا گرو ہے۔ ساری انارکلی اور مال روڈ کی دکانوں کا
سامان اس کی ایک لپیٹ میں سما جائے...... افراط دیکھ کر انسان ایشیا، افریقہ کی
بھوک اور قحط بھول جاتا ہے۔ اس جگہ بلا ارادہ اور بلاضرورت خریداری کرنا پڑتی
ہے ہر شے کی پچاس قسمیں اور ہر قسم چھت تک چُنی ہوئی۔''

بن داؤد میں داخل ہوتے ہی مجھے بھی مکّہ مکرّمہ کی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر
پانچ پانچ، دس دس ریال میں ہر مال بیچنے والی بساطی عورتیں بھول گئی تھیں۔ لیکن
مسور کی دال لفافے میں جمع کرنے والے بچے کی تصویر رہ رہ کر میرے سامنے آ
رہی تھی۔ پتا نہیں وہ بچہ کبھی اس جگہ آیا ہوگا یا نہیں؟ کیا کبھی وہ اس قابل ہو سکے گا
کہ بن داؤد سے اپنے لیے خود کوئی چیز خرید سکے؟ اسی اُدھیڑ بُن میں، میں اس
گوشے میں پہنچ گیا جہاں دنیا بھر کی عمدہ کمپنیوں کے موبائل فون کلیرنس سیل کے
نام پر رکھے گئے تھے لیکن حیرت اس وقت ہوئی جب وہاں ایک عرب میاں بیوی
کو کاؤنٹر پر کھڑے عرب نوجوان سے لڑتے دیکھا۔ میاں بیوی دو چار دن پہلے
ان سے کوئی موبائل خرید کر لے گئے تھے وہ شاید واپس یا تبدیل کرانے کے لیے
آئے تھے لیکن کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے نے صاف جواب دے دیا تھا۔ نوبت
جھگڑے تک پہنچ گئی تھی۔ میں لاہوری تھا اور لاہوریوں کے لیے یہ منظر کوئی نیا
نہیں۔ میں نے ہال روڈ اور حفیظ سنٹر کی دکانوں پر اس طرح کے لاتعداد منظر
دیکھے ہیں۔ موبائل فون اصل میں ہے ہی شیطانی چیز، جھگڑا اس کی گھٹی میں پڑا

ہے۔ خریداری پر جھگڑا، خریدنے کے بعد جھگڑا، کبھی کال آنے پر جھگڑا، کبھی کال نہ آنے پر جھگڑا۔ کبھی فیس بک پر جھگڑا، کبھی وٹس ایپ پر جھگڑا۔ موبائل فون اونٹ کی طرح کوئی بہت بڑی شے تو نہیں لیکن کل اس کی بھی کوئی سیدھی نہیں۔ ٹیڑھا پن اس کے سافٹ ویئر میں ڈال دیا گیا ہے۔ جھگڑے کا شور شرابا کم ہوا تو میں نے کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے سے ایک فون کی قیمت پوچھی۔ پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ فون کوئی عرب شیخ ہی خرید سکتا تھا۔ پھر میں نے اس لڑکے کو موبائلوں کی کلیرنس سیل والا کاغذ دکھایا تو بولا ”یہ فون سب بِک گئے ہیں۔“ میں سمجھ گیا کہ کلیرنس سیل کا یہ سارا کھڑاگ گاہکوں کو گھیر کر اس کاؤنٹر تک لانے کا ایک سلسلہ ہے۔ خانہ کعبہ کے عین سامنے، اہلِ تجارت کی یہ بے اصولی دیکھ کر جی خاصا پریشان ہوا۔ ظہر کی اذان کی آواز کان میں پڑی تو بن داؤد سے باہر نکل آیا۔ ویسے بھی نماز کے وقت دوسرے کاروباری مراکز کی طرح یہ سٹور بھی بند ہو جاتا ہے۔

سعودی عرب کا یوم الوطنی

خانہ کعبہ کے عین سامنے ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد ابھی میں ایک جگہ بیٹھا ہی تھا کہ شبنم کا فون آ گیا۔ کہنے لگی: ”اگر مناسب سمجھیں تو آج اپنی اور میری والدہ کی طرف سے الگ الگ طواف کر لیجیے۔“ پتا نہیں یہ التجا تھی یا حکم۔ سو میں اٹھا اور طواف کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ چونکہ بیش تر حاجی صاحبان اپنے اپنے ملک جا چکے تھے اس لیے طواف کرنے والے لوگ کم تھے۔ خانہ کعبہ کے قریب قریب رہتے ہوئے میں نے طواف کیا۔ دو نفل ادا کیے۔ سعی کی۔ یہی عمل دوبارہ کیا۔ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد بس پکڑ کر اپنے کمرے میں واپس آ

گیا۔

اگلے روز ستمبر کی بائیس تاریخ تھی۔ میں پھر خانہ کعبہ جا پہنچا ظہر اور عصر کی نماز ادا کر چکا تو جدّے سے ریحان کا فون آ گیا۔ کہنے لگا: ”شارع ابراہیم خلیلؑ کے قریب واقع کبری (اوور ہیڈ برج) کے نیچے ہائی ایس ویگنیں کھڑی ہوتی ہیں آپ پندرہ ریال ادا کر کے جدّہ پہنچ جائیں۔ میں آپ کو لینے کے لیے آ جاؤں گا۔“ میں نے ایسا ہی کیا۔ جدّہ پہنچا تو ریحان مجھے لینے کے لیے پہلے سے کھڑا تھا۔ ریحان نے دراصل مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے جدّے کا سمندر دکھائے گا۔ رات رفتہ رفتہ گہری ہو رہی تھی لیکن جدہ بُقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ سبز رنگ کی روشنیاں زیادہ تھیں سڑکوں پر من چلے عرب لڑکے بائیسکلیں اور موٹر سائیکلیں دوڑا رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر ریحان نے بتایا کہ کل 23 ستمبر کو سعودی عرب کا چھیالیسواں یوم الوطنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے آپ سعودی عرب کا یوم آزادی کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں یوم آزادی کی رات لڑکے سڑکوں پر موٹر سائیکلیں اور گاڑیاں لے کر آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں اسی طرح یہاں بھی ہوتا ہے۔ آج رات پولیس والے کسی کا چالان نہیں کریں گے۔ دکانوں اور تجارتی مراکز پر سبز رنگ کی روشنیاں بھی یوم الوطنی ہی کی وجہ سے ہیں ریحان نے مزید بتایا کہ آج سے 86 سال پہلے عرب کا یہ خطہ آلِ سعود کی عملداری میں آیا تھا اور سعودی عرب کہلایا تھا۔

سفید بادل

جدّے کی سڑکوں پر مجھے قدم قدم پر حیرتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک میں نے گاڑی کی ونڈ سکرین سے دیکھا کہ آسمان پر سفید بادل چھا گئے رات کے

اندھیرے میں آسمان پر سفید بادلوں کا وجود میرے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھا میں نے اس منظر کو ربِّ کائنات کی شان کا ایک مظہر جانا۔ ریحان سے رات کے اندھیرے میں پیدا ہو جانے والے ان سفید بادلوں کے بارے میں پوچھا تو بولا ''چند منٹ کے بعد سب کچھ آپ پر عیاں ہو جائے گا۔''

گاڑی جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی تُوں تُوں بادلوں کا حجم بڑھتا چلا جا رہا تھا اور میری حیرت میں بھی اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا لیکن جب ہماری گاڑی سمندر کے نزدیک پہنچی تو حیرت نقطۂ عروج پر پہنچ کر دم توڑ گئی۔ یہ سفید بادل نہیں تھے بلکہ عین سمندر کے اندر بنائے گئے شاہی محل کا بہت بلند و بالا فوارہ تھا۔ اس دیو ہیکل فوارے کو چلانے کے لیے بقول ریحان، ہیوی مشینری نصب کی گئی تھی۔

اسی اثناء میں عشا کی اذان ہو گئی قریب ہی بہت سے مُصلّے بچھے ہوئے تھے۔ ریحان نے کہا: ''آیئے! ہم نماز پڑھ لیں۔'' میں نے کہا ''میرا وضو نہیں ہے'' بولا ''کوئی بات نہیں ابھی وضو کر لیتے ہیں'' یہ کہہ کر وہ مجھے قریب کھڑی ایک گاڑی کے پاس لے گیا اس میں ایک بڑا ٹینکر فٹ تھا۔ اس میں ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں صابن بھی موجود تھا۔ اس گاڑی پر لاؤڈ سپیکر بھی لگا ہوا تھا۔ ریحان نے بتایا کہ سعودی عرب میں ''امر بن معروف نہی عن المنکر'' کے نام سے ایک سرکاری محکمہ ہے جو نماز قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ نماز کے وقت ادھر ادھر پھرنے والے لوگوں کو اس محکمے کے اہل کار نماز پڑھنے کی طرف کبھی پیار سے راغب کرتے ہیں کبھی سختی سے۔ اگر کوئی کہے کہ اس کا وضو نہیں ہے تو اسے وضو کے لیے پانی فراہم کرتے ہیں۔ قریب مسجد نہ ہو تو مصلے زمین پر بچھا دیتے ہیں۔ اس ادارے کے اہل کار گاڑی پر لگے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے سے اذان بھی دیتے ہیں۔

میری ہی طرح عشق کا پیکر ہے سمندر

g

جب میں اپنے کام سے تھک جاتا ہوں یا کسی کا غلط رویے دیکھ کر پریشان ہوتا ہوں یا تُھڑ دلی کی طرف مائل ہونے لگتا ہوں تو دریا کے کنارے جا پہنچتا ہوں۔ عام طور پر میرے بچے بھی میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ دریا کی کشادگی، روانی اور وسعت میری طبیعت میں کشادگی، روانی اور وسعت پیدا کر دیتی ہے۔ سمندر کی طرف جاتے ہوئے مَیں سوچ رہا تھا کہ سمندر دیکھ کر کہیں میں پاگل ہی نہ ہو جاؤں!

جدّے کا منی پاکستان

رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا پرسکون سمندر دکھانے کے بعد ریحان مجھے جدّے کے ایک بہت بڑے شاپنگ سنٹر ایس سمارٹ پلازا میں لے گیا۔ یہاں فروخت ہونے والی ہر چیز پر اس کی قیمت درج تھی۔ مَیں جس چیز کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اس کی قیمت پر نظر ڈالتا، تیزی سے دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیتا، لیکن ریحان نے بڑا دل کر کے میرے لیے یہاں سے ایک نہایت عمدہ مصلیٰ خریدا، جس کی قیمت تقریباً پچاس ریال تھی۔ یہ مصلیٰ اتنا دبیز اور نرم تھا کہ دل چاہتا تھا ابھی زمین پر بچھا لوں اور نماز کے لیے کھڑا ہو جاؤں۔ میں نے دل ہی دِل میں فیصلہ کیا مکّہ مکّرمہ واپس پہنچتے ہی پہلی نماز اس مُصلّے پر ادا کروں گا۔ یہاں سے نکلے تو ہم دونوں عزیزیہ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ مدینہ مُنوّرہ اور مکّہ مکّرمہ میں بھی عزیزیہ کے نام سے دو آبادیاں ہیں، لیکن جدّے کا عزیزیہ کچھ مختلف ہے۔ جدّے کے عزیزیہ کو آپ مِنی پاکستان بھی کہہ سکتے ہیں یہاں بیش تر دکانیں اور مارکیٹیں پاکستانیوں کی ہیں۔ پاکستان میں فروخت ہونے والی ہر چیز یہاں آسانی سے مل جاتی ہے۔ پراٹھا، نان، چنے، حلوہ پوری، مغز، نہاری، کباب، تِکّے جگہ جگہ بِک رہے تھے۔ حتیٰ کہ بعض دکانوں پر ایک دن پرانے پاکستانی اخبارات اور تازہ ڈائجسٹ بھی دستیاب تھے خواتین کے پسندیدہ میگزین زیادہ دکھائی دیے۔

پاکستان سے آنے والی سبزیاں بھی موجود تھیں۔ قریب ہی پاکستان انٹرنیشنل سکول تھا۔ سکول کے سامنے اسٹیشنری کی ایک دکان تھی۔ اس دکان میں ہر چیز وہی تھی جو لاہور کے کسی بھی محلے میں موجود اسٹیشنری کی کسی دکان میں ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں ہر چیز کی قیمت ریال میں تھی، جواد نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں سعودی عرب سے اس کے لیے ایک عدد قلم خرید کر لاؤں۔ روشنائی والے ایک قلم کی قیمت دریافت کی تو قیمت سُن کر پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ قلم پاکستان میں صرف بیس یا پچیس روپے میں مل جاتا ہے، لیکن یہاں یہ تقریباً تین سو پاکستانی روپے میں بیچا جا رہا تھا۔

کبابش ریسٹورنٹ سے ہم دونوں نے بڑے کا مغز اور نہاری کھائی۔ چپاتی، رائتا، سلاد اور چائے، سب کچھ پاکستانی تھا۔ اتنا لذیذ کھانا بہت دنوں کے بعد میسّر آیا تھا۔ ریحان نے میری شب بسری کا اہتمام ایک گیسٹ ہاؤس میں کر رکھا تھا۔ مجھے ایک شان دار کمرے کے حوالے کر کے وہ اپنے گھر چلا گیا۔

پرانا شکاری

صبح آنکھ کھلی تو 23 ستمبر کا سورج سعودی عرب کے یوم الوطنی کی خبر لے کر سر پر کھڑا تھا، جس کمرے میں میرا قیام تھا، اس کے سامنے ہی باورچی خانہ تھا۔ ناشتے کے لیے ہر چیز تیار تھی، لیکن مَیں نے صرف بیڈ ٹی طلب کی۔ ابھی میری چائے ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ریحان آ گیا۔ میرے ہاتھ میں چائے کا کپ دیکھ کر اس نے پوچھا: ''آپ نے کہیں ناشتا تو نہیں کر لیا؟'' اس کے لہجے کی گمبھیرتا سے لگا کہ یہاں کا ناشتا ٹھیک نہیں یا بہت مہنگا ہوگا جب مَیں نے اسے بتایا کہ بات ابھی بیڈ ٹی تک ہی پہنچی ہے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا: ''شکر ہے''۔ جب اس

نے میرے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے آثار دیکھے تو بولا: ''دراصل آج مَیں آپ کو عزیزیہ میں واقع کبابش ریسٹورنٹ سے پاکستانی ناشتا کروانا چاہتا ہوں۔'' چند لمحوں کے بعد ہم دونوں نان چنے اور حلوہ پوری سے ناشتا کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو ایک عجیب منظر دیکھا سڑک کے کنارے بہت سا غلہ زمین پر بکھرا ہوا تھا، جنگلی کبوتر دانہ چگ رہے تھے۔ کبوتروں کے قریب ہی ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا جال تھا۔اس نے وہ جال اتنی مہارت سے ان کبوتروں پر پھینکا کہ وہاں موجود بیش تر کبوتر اس میں پھنس گئے۔اس نے کبوتروں سے بھرا جال کاندھے پر ڈالا اور ساتھ والی گلی میں غائب ہوگیا۔ ریحان نے بتایا کہ یہ شخص ان کبوتروں کا گوشت خود کھائے گا یا کسی کو فروخت کرے گا۔ اس کے علاوہ اس ظلم کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں۔ میری حیرت تا حال قائم تھی۔ اس لڑکے نے جس مہارت کا مظاہرہ کیا تھا اس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضرور کوئی پرانا شکاری تھا۔

نیلا گرم سمندر

ہماری اگلی منزل سمندر کا ساحل تھا۔ میں نے ریحان سے خود فرمائش کی تھی کہ وہ مجھے اس بار جدّے کا سمندر ضرور کھائے۔ لاہور میں میرا مکان دریا سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جب میں اپنے کام سے تھک جاتا ہوں یا کسی کا غلط رویے دیکھ کر پریشان ہوتا ہوں یا تُھڑ دلی کی طرف مائل ہونے لگتا ہوں تو دریا کے کنارے جا پہنچتا ہوں۔عام طور پر میرے بچے بھی میرے ساتھ ہوتے ہیں۔دریا کی کشادگی،روانی اور وسعت میری طبیعت میں کشادگی، روانی اور وسعت پیدا کر دیتی ہے۔سمندر کی طرف جاتے ہوئے مَیں سوچ رہا تھا کہ

سمندر دیکھ کر کہیں میں پاگل ہی نہ ہو جاؤں! کیونکہ سمندر میں کشادگی، روانی اور وسعت کے علاوہ طوفان، تلاطم، گرداب، گہرائی اور بھٹک جانے کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔سمندر موت بھی ہے اور زندگی بھی، سمندر راستا بھی ہے اور منزل بھی۔

چند منٹ کی ڈرائیور کے بعد ہماری گاڑی سمندر کے سامنے تھی۔ ارے! یہ تو بالکل ویسا سمندر تھا، جیسا منیر نیازی نے اپنے ایک گیت میں دکھایا تھا۔

نیلا گرم سمندر
اوپر دھوپ کا شیشا چمکے
موتی اس کے اندر
نیلا گرم سمندر

مَیں نے پہلی بار سمندر ناروے کے شہر اوسلو میں دیکھا تھا، لیکن وہ سمندر گھٹا ٹوپ سیاہ بادلوں کے نیچے، کالی چادر اوڑھے کسی درویش کی طرح سویا ہوا تھا۔ جدے کا نیلا سمندر، اپنی نیلاہٹ میں آسمان کو شرما رہا تھا۔ اس کی لہروں کا جوش، اس کی کشادگی، اس کی روانی اور اس کی وسعت ویسی ہی تھی جیسی دیکھنا چاہتا تھا۔ لہریں بار بار انسانی ہاتھوں سے بنائی ہوئی پتھریلی دیوار سے ٹکراتے دیکھ کر مجھے میر انیس کا یہ شعر یاد آ گیا تھا۔

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹختی تھیں موجیں فرات کی

مَیں نے سمندر کو ایک قطرۂ آب سمجھا تھا، تبھی تو یہ شعر کہا تھا:

صحرا کے راستے میں سمندر بھی آئے گا
تھوڑا سا پاؤں بھیگنے کا ڈر بھی آئے گا

لیکن اپنے سامنے بچھے ہوئے اس سمندر کو دیکھ کر مجھے لگ رہا تھا کہ یہ میرے

سارے جسم کو اژدھے کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور پھر کبھی نہیں چھوڑے گا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک سمندر میرے اندر بھی ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ غزل یونہی تو نہیں ہو گئی تھی:

صحرا کی گواہی پہ سمندر ہے سمندر!
پیاسوں کے لیے پھر بھی ستم گر ہے سمندر!

موسم ہو کوئی رہتا ہے یہ اپنی ہی دھن میں
دیوانہ ہے، پاگل ہے، سخن ور ہے سمندر

کشتی کو بچانے کے لیے کوئی نہ آیا
جب اس نے کہا تھا، مرے اندر ہے سمندر

آتا ہے ڈبونے یہ ہمیں قطرہ بہ قطرہ
اک روز کُھلے گا کہ فلک پر ہے سمندر

لگتا ہے کہ پھر چاند کوئی ڈوب گیا ہے
آج اپنے کناروں سے بھی باہر ہے سمندر

ہے آبلہ پائی کے نصیبوں میں یہ صحرا
روتی ہوئی آنکھوں کا مقدر ہے سمندر

روتا بھی ہے، ہنستا بھی ہے، گاتا بھی ہے ناصرؔ
میری ہی طرح عشق کا پیکر ہے سمندر

سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر مجھے لگ رہا تھا کہ میرا جسم بھیگا ہوا ہے۔

یہاں تلک میں سمندر سے ہو کے آیا ہوں
بدن یہ سارے کا سارا بھگو کے آیا ہوں
تمہارے سامنے ہنستا ہوں، پاگلوں کی طرح
مَیں اپنی ذات کے حجرے میں رو کے آیا ہوں

لاہور قہقہوں کی آواز

سمندر کے کنارے پر بھی مجھے ادارہ ''امر بن معروف، نہی عن المنکر'' کی ایک گاڑی دکھائی دی جو مسجد کے سارے لوازمات سے مزین تھی، چونکہ جمعۃ المبارک کا دن تھا اس لیے سعودی حکومت نے یہ گاڑی یہاں کھڑی کر رکھی تھی۔ وہ نماز سے کسی کو غافل نہیں ہونے دیتے۔ برقع پہنے ہوئے ایک لڑکی عین سمندر کے اندر ایک بڑے پتھر پر کھڑی تھی۔ لہریں اس کے قدموں کو چومتیں اور واپس چلی جاتیں۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی حوصلہ ملا اور میں بھی سمندر کے اندر جا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ لوگ مچھلیاں پکڑنے کے لیے کانٹا ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سمندر کے عین بیچوں بیچ ایک مسجد بنی ہوئی تھی جسے ''مسجد الرحمہ'' کا نام دیا گیا تھا، بہت سے حاجی بسوں پر سوار ہو کر یہاں آئے ہوئے تھے۔ حج آرگنائزرز کے لیے میری تجویز ہے کہ اگر وہ حجاج کرام کو ایک دن کے لیے مکّہ مکرّمہ سے جدّے کے ساحل پر لے آیا کریں تو شاید بہت سوں کی تنگیٔ داماں کا علاج ہو جائے۔

سمندر اور ساحل کی سیر کے بعد ریحان مجھے اپنے گھر لے آیا۔ وہ جس سعودی جرمن ہسپتال میں کام کرتا ہے اس کی انتظامیہ نے اپنے ملازمین کو چھوٹے چھوٹے فلیٹ بنا کر دیے ہوئے ہیں۔ ریحان کا چھوٹا سا فلیٹ، اس کی دو بہت خوبصورت اور گول مٹول بیٹیوں کے وجود سے مہکتا ہے، جنھیں اس نے مائرہ اور عائزہ کا نام

دے رکھا ہے۔ جب ان دونوں ننھی پریوں نے میرے ساتھ اپنی پسندیدہ آئس کریم کھائی تو کچھ ان کے گلابی گالوں پر لچھے کی طرح چپک گئی۔ مَیں نے اپنے موبائل سے ویڈیو کال ملائی اور اپنے بچوں کو مائرہ اور عائزہ کے آئس کریم سے لتھڑے ہوئے خوبصورت چہرے دکھائے تو لاہور میں بلند ہونے والے قہقہے اس چھوٹی سی جنّت میں بھی سُنے اور دیکھے گئے۔

نمازِ جمعہ کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ چنانچہ جلدی سے وضو کر کے ہم قریبی مسجد کی طرف بھاگے۔ ریحان کی بڑی بیٹی مائرہ بھی ساتھ ہولی۔ ریحان نے بتایا کہ نماز کے بعد امام صاحب، نماز کے لیے آنے والے بچوں میں گفٹ پیک تقسیم کرتے ہیں، جس سے بچوں میں بچپن ہی میں باجماعت نماز ادا کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز کے بعد ریحان نے مائرہ کو گھر چھوڑا اور ہم ایک بار پھر مکّہ مکرّمہ کی طرف چل پڑے۔

صلح حدیبیہ کے مقام پر

مَیں جدّے سے مکّہ مکرّمہ کے درمیان پہلے بھی ایک سے زائد مرتبہ سفر کر چکا تھا۔ ریحان جس راستے سے مکّہ مکرّمہ کی طرف اُڑا چلا جا رہا تھا مجھے اجنبی لگا۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو مَیں نے اس سے اس راستے کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ بولا: ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ نیا راستا ہے۔ مَیں دراصل آپ کو ایک قدیم علاقہ حدیبیہ دکھانا چاہتا ہوں، جہاں مسلمانوں اور قریشِ مکّہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ جسے صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی قیادت خود حضورِ پاکؐ نے فرمائی تھی اور قریشِ مکّہ کی قیادت خالد بن ولید نے کی، تب خالد بن ولید مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس معاہدے سے قریشِ مکّہ نے مسلمانوں کی قوت کو تسلیم کیا تھا۔ اسی صلح

نامے کے باعث قریش نے مسلمانوں کے حقِ عمرہ کو مانا۔ دوسرے قبائل کے ساتھ معاہدوں کا راستا ہموار ہُوا اور حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے والے مسلمان لوٹ کر مدینہ مَنّورہ آ گئے تھے''۔

آخر ایک جگہ ریحان چُپ ہو گیا اور اس کی گاڑی رُک گئی۔ بولا: ''یہ ہے حدیبیہ کا مقام جسے آج کل شمیسی کہتے ہیں۔ اسے حدیبیہ اس لیے کہتے ہیں کہ کبھی یہاں حدیبیہ نامی ایک کنواں تھا''۔

یہ علاقہ آج بھی ایک گاؤں کی طرح ہے۔ دُور دُور اِکا دُکا مکانات دیکھ کر لگا کہ یہاں کی آبادی بہت کم ہے۔ زیارت کے لیے آنے والوں کے لیے مقامی لوگوں نے دو چار دکانیں بنا رکھی ہیں۔ ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی، لیکن یہ مسجد کچھ زیادہ پرانی نہ تھی، یہاں ہم نے انڈونیشیا اور ملائیشیا سے آئے ہوئے کچھ حاجی صاحبان کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ریحان مجھے ایک چھوٹی سی گلی سے گزار کر اس گاؤں کے اندر لے گیا۔ وہاں پتھروں سے بنائی گئی چند نہایت خستہ حال دیواریں تھیں۔ لگتا تھا کہ یہاں کبھی مسجد رہی ہو گی۔ مجھے لگا کہ شاید یہ وہی جگہ ہے جہاں حضور پاکؐ اپنے چودہ سو ساتھیوں کے ساتھ رُکے تھے۔ اِس مقام سے وابستہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت محمدؐ نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ مکّہ مکرّمہ میں موجود ہیں اور خانہ کعبہ کے طواف اور مناسکِ عمرہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے عمرہ ادا کرنے کے لیے مکّہ مکرّمہ روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔

628 عیسوی، یعنی 6 ہجری میں چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ آپؐ مدینہ مَنّورہ سے مکّہ مکرّمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ تب یہ روایت تھی کہ غیر مسلح افراد چاہے وہ دُشمن ہی کیوں نہ ہوتے، کعبے کی زیارت کر سکتے تھے۔ حضور پاکؐ کے تمام ساتھی تقریباً غیر مسلح تھے، مگر عرب کے رواج کے خلاف مشرکینِ مکّہ نے خالد بن

ولید (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) کی قیادت میں دو سو مسلح سواروں کے ساتھ مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام کے باہر ہی روک لیا۔ حضور پاکؐ نے حضرت عثمان غنیؓ کو سفیر بنا کر مکّہ بھیجا۔ لیکن انھیں وہاں روک لیا گیا۔ حضورؐ نے صحابہؓ سے اس مقام پر بیعت لی جو بیعتِ رضوان کے نام سے مشہور ہے۔ اس بیعت میں صحابہ کرامؓ نے عہد کیا کہ وہ مرتے دم تک حضورؐ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت عثمان غنیؓ واپس آ گئے۔ جب مکّے والوں کو اِس بیعت کی خبر ہوئی اور انھوں نے مسلمانوں کو جنگ کے لیے تیار پایا تو صلح پر آمادہ ہو گئے اور آپؐ نے ان کی شرائط کو قبول فرما لیا۔ اس کا فائدہ یہ ہُوا کہ مسلمان جو تعداد میں تھوڑے اور غیر مسلح تھے، جنگ سے بچ گئے اور اس سے اگلے سال مکّہ مکرّمہ میں داخل ہوئے۔

خدا کے گھر میں شہنشاہ بھی دو زانو ہیں

h

مَیں پورے دو دن خانہ کعبہ سے دُور رہا تھا۔ اگلے دن مسجد الحرام پہنچا تو میرے دِل میں چور تھا جیسے کسی کی نئی نئی شادی ہوئی ہو اور وہ اپنی نئی نویلی دُلہن کو چھوڑ کر کہیں چلا جائے اور جب واپس آئے تو شرمندگی اس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت میری بھی تھی۔ بے زبان خانہ کعبہ ہم سب کی سنتا ہے لیکن شکر ہے کہ ہمیں کہتا کچھ نہیں۔ اگر ہماری طرح یہ بھی بول سکتا تو ہم میں سے بہت سوں کے حج اور عمرے کے بارے میں پتا چل جاتا کہ قبول ہوئے ہیں یا نہیں۔

عجائب خانہ

مقامِ حدیبیہ سے نکلے تو چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم مکّہ مکرّمہ سے دس کلومیٹر پہلے بنائے گئے عجائب گھر کے قریب پہنچ گئے۔ یہ عجائب گھر نہ صرف تاریخی لحاظ سے اہم ہے، بلکہ اس کی مذہبی حوالے سے بھی بہت اہمیت ہے۔ یہاں خانہ کعبہ، مسجدِ الحرام اور مسجدِ نبویؐ سے متعلق وہ اشیاء رکھی گئی ہیں جو ماضی میں ان مقامات کا حصہ رہی ہیں۔ وقت اگرچہ شام کا تھا لیکن اس کے باوجود یہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔لوگ نہایت اشتیاق کے ساتھ ہر چیز کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ان کی تصویریں بنا رہے تھے۔ یہ عجائب گھر دیکھ کر مجھے لاہور میں الحاج محمد حسین گوہر کا عجائب گھر یاد آ گیا۔ حاجی صاحب نے اپنے مکان کے ڈرائنگ روم میں مکّہ مکرّمہ، مدینہ منوّرہ، ایران اور عراق سے لائی جانے والی قدیم اور عظیم مذہبی شخصیات سے وابستہ اشیاء محفوظ کر رکھی ہیں۔حتیٰ کہ حضور پاکؐ کے موئے مبارک بھی محفوظ ہیں۔حاجی صاحب غلافِ کعبہ کی سلائی کے عمل میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ 2014ء میں جب مَیں پہلی بار اپنے دوستوں شعیب مرزا اور ایم آر شاہد کے ساتھ ان کے ہاں گیا تھا تو انھوں نے مجھے سیاہ اور سفید غلافِ کعبہ کے دو ٹکڑے عطا کیے تھے جو فریم میں محفوظ کیے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب شبنم کی ملنے والیاں گھر آتیں تو وہ غلافِ کعبہ کے ان ٹکڑوں کو حسرت اور حیرت سے

دیکھتیں اور دُعا مانگتیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو کعبہ اور غلافِ کعبہ چھونے کی سعادت عطا کرے۔اِس واقعہ کے بعد 2015ء میں، ہم دونوں کو اللہ کے گھر سے بلاوا آ گیا۔ہم نے ایک ساتھ عمرہ کیا۔

مکّہ مکرّمہ کے عجائب خانے سے باہر نکلنے لگے تو دروازے میں عربی لباس پہنے ایک صاحب کھڑے تھے۔ ایک کارٹن اُن کے قریب دھرا تھا۔ وہ ہر گزرنے والے کو اِس کارٹن سے نکال نکال کر قرآن پاک کا ایک ایک نسخہ عطا کر رہے تھے۔سو مجھے بھی ملا۔ مَیں نے کھول کر دیکھا تو یہ بغیر ترجمے کے تھا، لیکن پھر بھی مَیں نے تحفہ جان کر رکھ لیا۔ان کے قریب ہی ایک اور صاحب بھی کھڑے تھے جو ہر آنے والے کو کھجوروں سے بھرا ایک ایک پیکٹ دیتے جاتے تھے۔اس عجائب خانے کے صحن میں ایک چھوٹا سا گراسی گراؤنڈ بھی ہے جسے دیکھ کر آنکھوں کو خنکی کا احساس ہوتا ہے۔گھاس دیکھ کر مجھے اِس لیے حیرت ہوئی کہ مکّہ مکرّمہ کی سخت اور پتھریلی زمین میں اس کے اُگنے کی گنجائش ہی نظر نہیں آتی۔

جدائی کی معافی چاہتا ہوں

مَیں پورے دو دن خانہ کعبہ سے دُور رہا تھا۔ اگلے دن مسجد الحرام پہنچا تو میرے دِل میں چور تھا جیسے کسی کی نئی نئی شادی ہوئی ہو اور وہ اپنی نئی نویلی دُلہن کو چھوڑ کر کہیں چلا جائے اور جب واپس آئے تو شرمندگی اس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت میری بھی تھی۔ بے زبان خانہ کعبہ ہم سب کی سنتا ہے لیکن شکر ہے کہ ہمیں کہتا کچھ نہیں۔اگر ہماری طرح یہ بھی بول سکتا تو ہم میں سے بہت سوں کے حج اور عمرے کے بارے میں پتا چل جاتا کہ قبول ہوئے ہیں یا نہیں۔خانہ کعبہ سے دو روزہ جدائی کی تلافی کے لیے مَیں نے فیصلہ کیا کہ آج

سارا دن اور ساری رات خانہ کعبہ کے ساتھ گزاروں گا۔ سو اِس روز مَیں نے اللہ کے گھر سے جدائی کی یوں تلافی کی کہ زیادہ سے زیادہ ثواب سمیٹنے کے لیے، اپنے والدِ گرامی، اپنی بڑی ہمشیرہ اور بیگم کے نام کے تین مکمل طواف کیے، یعنی وہ طواف جن کے آخر میں صفا و مروہ کی سعی بھی کی جاتی ہے۔ اس طرح کا ایک طواف ہی تھکا دینے والا ہوتا ہے لیکن مجھے تین طواف کرنے کے بعد بھی تھکاوٹ کا احساس نہیں ہُوا۔ یہ جو مَیں ایک ہی دن میں کئی کئی طواف کر لیتا تھا اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خانہ کعبہ کے بہت قریب رہ کر سات چکر پورے کرتا تھا۔ اگر آپ خانہ کعبہ کے قریب رہ رہ کر چلیں تو سات چکر سات منٹ میں لگا سکتے ہیں، جو لوگ ہجوم سے بچنے کے لیے کعبے سے دور رہ کر طواف کرتے ہیں وہ دو چار چکروں ہی میں چکرانے لگتے ہیں۔

عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا کھانے کے لیے حرم سے باہر نکلا لیکن جلد ہی واپس آ گیا اور وضو کر کے عین کعبے کے روبرو اپنا وہی دبیز اور نرم مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گیا جو مجھے ریحان نے جدّہ سے لے کر دیا تھا۔ مجھے اس پر بیٹھ کر اتنا مزہ آ رہا تھا کہ کبھی دوزانو ہو کر بیٹھ جاتا، کبھی چوکڑی مار لیتا۔ ایک ستون کے ساتھ سر لگا کر اِسی مُصلّے پر کچھ دیر کے لیے نیم دراز بھی ہُوا۔ میرے لیے یہ ایک خاص رات تھی۔ مَیں پہلی بار عین کعبے کے سامنے رَت جگا کرنے والا تھا۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ عبادت کیا ہے؟ مجھے بچپن میں ریڈیو پاکستان سے سُنی ہوئی ایک غزل کا مطلع یاد آ گیا:

وہ سامنے ہو تو کیسے اِدھر اُدھر دیکھوں
مَیں اس کی سمت نہ دیکھوں تو پھر کدھر دیکھوں

جسے آپ دِل سے چاہتے ہیں، اسے پیار سے دیکھنا بھی عبادت ہے۔ اگرچہ

مجھ پر دیوانگی طاری ہو چکی تھی لیکن اپنے گردو پیش سے پوری طرح باخبر تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ بکارِ خویش ہشیار تھا۔ اس رات کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر مَیں اپنے رب کے جلوے دیکھتا رہا۔ مَیں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ مَیں لوگوں کے چہرے دیکھنے اور پڑھنے کا شوقین ہوں۔ سو یہ شغل یہاں بھی جاری رہا۔ اپنے بائیں طرف مجھے ایک سولہ سترہ سال کی بچی بیٹھی نظر آئی۔ پتا نہیں وہ کس سوچ میں گُم تھی، لیکن پھر وہ اچانک سنجیدہ ہو کر بیٹھ جاتی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی چشمِ تخیل کے سامنے کوئی فلم چل رہی ہے جس میں کبھی سنجیدہ منظر آ جاتا ہے اور کبھی مزاحیہ یا شاید وہ اپنے ہی بُنے ہوئے کسی خواب میں گم تھی۔ مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا:

اب مرا ہاتھ چھوڑ دے اے دوست
عالمِ خواب سے نکلنے دے

اچانک مَیں نے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک نیا منظر دکھائی دیا۔ ایک انگریز جو شاید تازہ تازہ مسلمان ہوا تھا، عین خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے دوزانو بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات خاصی حیران کن تھیں۔ کبھی وہ اچانک ہنسنا شروع کر دیتا اور کبھی رونے لگتا۔ کبھی یوں لگتا کہ گانا گا رہا ہے۔ گانا گانے کی اداکاری کرتا تو پورا منہ کھولتا، بازو بار بار فضا میں بلند کرتا، پھر یوں تاثر دیتا جیسے داد وصول کر رہا ہے۔ کبھی یوں لگتا کہ اس نے گٹار تھاما ہُوا ہے اور انگلیوں سے بجا رہا ہے۔ پھر اچانک اُس نے اپنے پاس پڑی ایک چھوٹی سی مسواک اٹھائی اور دانتوں میں سگریٹ کی طرح دبا لی۔ پھر سگریٹ ہی کی طرح کبھی دانتوں میں دبا لیتا، کبھی دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں۔ وہ مسواک کو سگریٹ سمجھ کر اس کی راکھ بھی جھاڑتا۔ مجھے اس کی شخصیت خاصی دلچسپ لگ رہی تھی۔ مَیں نے اُس کی طرف

دیکھنا شروع کیا تو کئی دوسرے لوگ بھی اُس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔ پھر اُس نے مسواک ایک طرف رکھ دی۔ بالکل یوں بیٹھ گیا جیسے نماز ادا کر رہا ہے۔ مَیں اُس کی جانب دیکھتا رہا۔ اُس نے اپنا ہاتھ خانہ کعبہ کی طرف یوں بڑھایا جیسے ابھی اُسے اپنی مٹھی میں لے لے گا۔ پھر نہایت احتیاط سے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ کو اپنے سینے کے قریب لایا۔ یوں لگا جیسے خانہ کعبہ اُس کی مٹھی میں آ گیا ہے اور اب یہ اسے اپنے سینے سے لگا رہا ہے۔ خانہ کعبہ کو سینے سے لگانے کے بعد اُس نے اُسے فضا میں اُڑا دیا۔ پھر یک دم ہاتھ فضا میں بڑھایا اور خانہ کعبہ کو ادب سے تھاما اور چومنے لگا۔ اس کی ایک اور حرکت بھی میرے لیے حیران کن تھی۔ وہ اپنے قریب سے گزرنے والے لوگوں کو روک روک کر ان سے مصافحہ کرتا۔ اُسے دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ اللہ کی ہر مخلوق اپنے رنگ میں، اپنے ڈھب سے اور اپنی زبان میں بندگی کا اقرار کرتی ہے۔ اس شخص کی حرکات سے مَیں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ شخص کون ہے؟ لیکن خانہ کعبہ کے روبرو بیٹھ کر مَیں کسی بدگمانی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بس اس شخص کو دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ دِل سے دُعا نکلی: ''اللہ تعالیٰ اس کی حاضری قبول کرے۔ آمین!''

ابابیل اور عام الفیل

اللہ کے گھر کے سامنے بیٹھ کر، اُسے یاد کرتے کرتے آدھی سے زیادہ رات بیت گئی، لیکن آج نیند نے مجھ پر مہربانی کی تھی، آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ زندگی میں تہجد کی پہلی نماز پڑھ لی تو مَیں ایک بار پھر چوکڑی مار کے بیٹھ گیا۔ اچانک اوپر نظر اُٹھی تو وہاں بہت سی ابابیلیں دکھائی دیں جو عین خانہ کعبہ کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے پرندے آج بھی اللہ کے گھر کی حفاظت کے لیے کمر

بستہ نظر آئے۔ یہی ابابیل تھے جنھوں نے ابرہہ کے طاقتور ہاتھیوں کو کنکر مار مار کے مار ڈالا تھا۔

570 عیسوی میں یمن کے گورنر ابرہہ نے مکّہ مکرّمہ پر حملہ کیا، وہ صرف کعبے کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ حضور پاکؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ اس گھر کا مالک خود اِس کا محافظ ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ ابرہہ کے لشکر اور ہاتھیوں پر ابابیلوں نے سنگ باری کی۔ سب کچھ تباہ ہو گیا، لیکن خانہ کعبہ محفوظ رہا۔ خود ابرہہ زخمی حالت میں یمن کی طرف فرار ہو گیا، لیکن راستے ہی میں مر گیا۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اسے نقطۂ آغاز بنا کر قریش مکّہ نے ایک نیا کیلنڈر عام الفیل بنا لیا جو حضرت عمرؓ کے دور تک جاری رہا، ہجری کیلنڈر جاری ہوا تو عام الفیل کیلنڈر ختم ہو گیا۔ حضور پاکؐ کی ولادت باسعادت اِسی سال ہوئی تھی، جس میں ابابیلوں نے ابرہہ کے لشکر کو تباہ و برباد کیا تھا، اِس لیے کہا جاتا ہے کہ حضرت محمدؐ کی پیدائش سن ایک عام الفیل میں ہوئی۔ انگریزی میں اسے The year of the elephants کہتے ہیں۔ قرآن پاک کی سورۂ الفیل میں اسی واقعے کا ذکر کیا گیا ہے۔

نمازِ فجر باجماعت ادا کرنے کے بعد حرم سے باہر نکلا تو راستے کے دونوں طرف ایک عارضی بازار لگا ہُوا دکھائی دیا۔ برقعوں میں لپٹی حبشی عورتیں، عورتوں، مردوں اور بچوں کی ضرورت کا سامان زمین پر رکھ کر بیچ رہی تھیں۔ دونوں کی ضرورت پوری ہو رہی تھی، بیچنے والوں کی بھی اور خریدنے والوں کی بھی۔ مال سستا تھا اس لیے ہاتھوں ہاتھ بِک رہا تھا۔ مَیں نے بھی ایک حبشی عورت سے دس دس ریال میں کچھ انڈین دوپٹے خریدے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ وزن میں کم ہوتے ہیں اور جگہ بھی نہیں گھیرتے۔ پاکستان لانے میں آسانی رہتی ہے۔ ایک حبشی عورت نے اپنا سامان شاید غلط جگہ رکھا ہوا تھا اِس لیے کچھ سرکاری حکام اس کا سارا سامان اپنی

گاڑی میں اٹھا کر چلتے بنے اور وہ بے چاری روتی رہ گئی۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ اس بے چاری کو بعد میں اس کا سامان مل گیا ہو گا، کیونکہ سامان اٹھانے والوں نے اسے کوئی رسید دی نہ فون نمبر، بس یہ جا اور وہ جا۔ وہاں موجود لوگوں نے جب یہ ظلم دیکھا تو اُنھوں نے پانچ پانچ دس دس ریال کے نوٹ اس خاتون کے آگے رکھ دیے۔ مجھے لگا کہ اُس غریب خاتون کو پانچ پانچ دس دس ریال دینے والے تمام لوگ ابابیل ہیں اور یہ نوٹ کنکریاں۔ ممکن ہے کہ اس سے اس کی غربت کا ہاتھی ضرور مر گیا ہو گا۔

سرسبز درخت

میرے سکول کے زمانے کے ایک استادِ محترم طبیعت کے کے ذرا سخت تھے۔ انھوں نے سال کے چار موسموں کے اعتبار سے بَید کی چار الگ الگ چھڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پڑھاتے ہوئے ہروقت ایک چھڑی اُن کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو بچہ اُن کے نزدیک بیٹھا ہوتا، اُسے وہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک آدھ چھڑی رسید کر دیتے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صبح سویرے بچے کلاس روم میں آتے تو آخری ڈیسکوں پر بیٹھنے کی کوشش کرتے، استادِ محترم کو اِس بات کا پتا چلا تو انھوں نے نہایت پتے کی بات کہی جو مجھے آج بھی یاد ہے۔ کہنے لگے: ”جو درخت دریا کے قریب ہوتے ہیں، وہ دوسرے درختوں کی نسبت زیادہ سرسبز ہوتے ہیں۔ اِس لیے میرے پاس بیٹھنے کی کوشش کیا کرو۔ مجھ سے دُور رہو گے تو خشک ہو جاؤ گے“۔

اپنے استادِ محترم کی یہ بات مجھے اِس لیے یاد آئی کہ اگلے روز نمازِ ظہر سے پہلے مَیں خانہ کعبہ گیا تو دھوپ بہت تیز تھی، بہت کم لوگ طواف کر رہے تھے۔ بیش تر

برآمدوں کے تلے بچھے مُصلّوں پر بیٹھ کر اللہ اللہ کر رہے تھے۔ مَیں نے اپنا نرم اور دبیز مصلّیٰ نکالا، تیز اور جھلسا دینے والی دھوپ میں خانہ کعبہ کے سامنے بچھا کر بیٹھ گیا۔ مَیں بظاہر دھوپ میں تھا، لیکن حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں تھا۔ مَیں رحمتوں کے دریا کے قریب رہ کر سرسبز و شاداب ہونا چاہتا تھا۔ اذان ہوئی تو میرے اردگرد لوگ یوں بیٹھتے چلے گئے کہ صف بندی ہو گئی۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو میری طرح رحمتوں کے دریا کی قربت میں رہ کر سرسبز و شاداب ہونا چاہتے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیا خبر دور بیٹھنے والے لوگ پہلے ہی سرسبز و شاداب ہو چکے ہوں۔ اللہ تو سب کا ہے، اس کی رحمتیں اور نعمتیں سب کے لیے ہیں۔ وہ تو اپنی مخلوق پر برابر مہربان ہے۔ روشنی، ہَوا، بارش اور طرح طرح کی نعمتیں اُس نے سب میں برابر تقسیم کر دی ہیں۔ اسی کا نام رحمتِ عام ہے۔ ہاں جس سے وہ خوش ہوتا ہے، اُس پر اپنی خاص رحمت کی بارش کر دیتا ہے۔ اُس کے دِل میں اپنی اور اپنی مخلوق کی محبت ڈال دیتا ہے۔

اُسی روز مغرب سے پہلے پہلے مَیں نے اپنی بیٹی اُجالا اور بیٹے احسن کے نام کے طواف کیے، بلکہ یہاں یہ واقعہ لائق ذکر ہے کہ جب مَیں احسن کے نام کا طواف کر رہا تھا تو پانچویں چکر میں مغرب کی اذان ہو گئی۔ سو تمام لوگ طواف روک کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ مَیں چونکہ خانہ کعبہ کے قریب رہ کر طواف کر رہا تھا اس لیے مجھے نماز کے لیے جگہ، حطیم کے سامنے ملی۔ اوپر دیکھا تو میزابِ رحمت تھا۔ میزابِ رحمت، خانہ کعبہ کی چھت کا پرنالہ ہے۔ ابرِ کرم برسے تو یہ پرنالہ، رحمت کا تسلسل بن جاتا ہے۔ لُطف کی بات یہ ہوئی کہ نماز کھڑی ہوئی تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی، ہلکی ہلکی پھوار میں نماز کا لُطف دوبالا ہو گیا۔ مَیں نے پنڈی سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ ہر سال کس طرح حج

کرنے آ جاتے ہیں؟ کہنے لگے : میرے پاس یقین کی دولت ہے۔ بس یہی دولت میرے کام آتی ہے اور اللہ کی رحمت جوش میں آ کر مجھے یہاں بُلا لیتی ہے''۔ مَیں نے پوچھا: ''کیسے؟'' بولے: ''مَیں حج کرنے کے بعد پاکستان جاتے ہی یہ نیّت کر کے ایک نیا جوڑا سلواتا ہوں کہ اگلے سال حج کے موقع پر مکّہ مکرّمہ میں پہنوں گا۔ یہ جوڑا میری کپڑوں کی الماری میں لٹکا رہتا ہے۔ ہر روز اِسے دیکھتا ہوں اور اللہ کو یاد کرتا ہوں۔ یہ سُن کر آپ کو حیرانی ہوگی کہ مجھے میرا یقین پچھلے کئی برسوں سے ہر سال، اِس مقدس سرزمین پر لا رہا ہے''۔

اس آدمی کی یہ بات سُن کر مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ ایک شہر میں خشک سالی ہوئی تو فیصلہ کیا گیا کہ کل شہر کے سب سے بڑے میدان میں نمازِ استسقا ادا کی جائے گی۔ اگلے روز شہر کے ہزاروں لوگ نماز ادا کرنے کے لیے کھلے میدان میں جمع ہو گئے۔ ان میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا۔ وہ اپنے ساتھ چھتری لے آیا تھا۔ گویا اسے یقین تھا کہ وہ آج نمازِ استسقا ادا کرے گا تو بارش ضرور ہوگی۔

اُس روز دِل کی عجیب کیفیت تھی، یہ سات اشعار اُسی کیفیت کے آئینہ دار ہیں، جنھیں مَیں نے ''ارمغانِ کعبہ'' کا عنوان دیا ہے:

نمازِ عشق سے بڑھ کر کوئی نماز نہیں
نگاہِ دِل سے جو دیکھو تو کچھ بھی راز نہیں

یہ اور بات سبھی سر جھکائے پھرتے ہیں
وہ کون ہے جو یہاں آ کے سرفراز نہیں

خدا کے گھر میں شہنشاہ بھی دوزانو ہیں
یہاں کسی کو بھی زیبا، غرور و ناز نہیں

دِلوں کے بھید بھی سب جانتا ہے میرا خدا
ہے بے نیاز مگر پھر بھی بے نیاز نہیں

جدھر بھی دیکھیے سجدے میں لوگ ہیں ناصؔر
عقیدتوں کے کہاں سلسلے دراز نہیں

وہ اَبر کیا ہے جو برسے نہ دشت پر ناصؔر
وہ شاعری ہی نہیں جس میں کچھ گداز نہیں

۞۞۞

دیکھ آیا ہوں میں طائف کے سفر میں کیا کیا!

i

ملکہ نے تقریباً 70 لاکھ دینار نہر کی تعمیر پر خرچ کیے۔ کہتے ہیں کہ جب ملکہ کو نہر کا کام مکمل ہونے پر سارا حساب پیش کیا گیا تو وہ دجلہ کے کنارے اپنے محل میں تھی۔ اُس نے حساب کے کاغذات پر نظر ڈالے بغیر کہا کہ انھیں دریا میں پھینک دیا جائے۔ مَیں نے یہ کام اللہ کے لیے کیا ہے اِس میں حساب کیسا؟

اسلم کی زبانی یہ واقعہ سُن کر مجھے اُردو کی کہاوت ''نیکی کر دریا میں ڈال'' یاد آ گئی۔ کہیں یہ کہاوت ملکہ زبیدہ ہی کی عطا تو نہیں؟

طائف دیکھنے کا اشتیاق

جب آپ دِل ہی دِل میں کوئی ارادہ کر لیتے ہیں تو قدرت بھی آپ کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ مَیں نے سوچا تھا کہ اِس بار طائف شہر بھی دیکھنے جاؤں گا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں حضور پاکؐ دعوتِ اسلام کے لیے تشریف لے گئے تھے،لیکن وہاں کے سخت دِل لوگوں نے آپ کو پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔ جب مَیں 2015ء میں عمرہ ادا کرنے سعودی عرب گیا تھا تو ریحان، مجھے اور میری بیگم کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر مکّہ مکرّمہ کے ایک مضافاتی علاقے کی طرف چل پڑا۔ چند منٹوں کی مسافت کے بعد سڑک کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے اور ہرے بھرے درخت دکھائی دینے لگے،حتیٰ کہ خود رو گھاس بھی جا بجا پھیلی نظر آ رہی تھی۔ اس علاقے میں پہنچ کر شدید گرمی کے باوجود خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ جب مَیں نے ریحان سے اِس علاقے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا تھا کہ یہ راستا طائف کی طرف جاتا ہے۔ طائف مری کی طرح ایک ٹھنڈا پہاڑی مقام ہے۔ عرب شیوخ نے طائف میں اپنے محل بنا رکھے ہیں۔ اِن محلّات میں وہ اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ چھٹیوں کے دن گزارنے آتے ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ طائف میں بہت سے فیملی پارک اور باغات بھی ہیں۔ انگور اور انجیر اِس علاقے کی خاص سوغات ہیں۔

ریحان کی یہ ساری باتیں سُن کر میرے دِل میں اشتیاق پیدا ہوا تھا کہ اگر موقع ملا تو طائف شہر دیکھنے ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ مَیں نے لاہور میں مقیم ممتاز شاعر اور اسم بامسمیٰ شخصیت توقیر احمد شریفی صاحب سے رابطہ کیا۔توقیر صاحب ایک نہایت باوقار آدمی ہیں اور شرافت کا پیکر ہیں۔انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً چالیس برس سعودی عرب میں گزارے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں۔وہ یہاں کام کرنے والی ایک پاور کمپنی کے جنرل منیجر تھے۔اب ریٹائر ہو چکے ہیں،لیکن اِسی پاور کمپنی کے لاہور آفس میں اب بھی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''یاد کے کنارے'' چھپا تو اہلِ سخن نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ان کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ کیجیے:

خانوادے کو بہت احساس تھا تعظیم کا
نام بھی توقیر احمد سوچ کر رکھا گیا

لگے ہاتھوں آپ ان کے یہ اشعار بھی پڑھیے اور سر دُھنیے۔

یہ فقیری مجھے شاہی سے کہیں بڑھ کر ہے
میں ہوں درویش تو درویش پکارا جائے

....

صبح دم ہم کو پرندے یہ بُلاتے ہیں میاں
مسئلہ ان کا درختوں کو جگانے کا نہیں

....

یُوں اشک مری آنکھ نے وارے ہی نہیں تھے
اُس ہاتھ میں رُخصت کے اشارے ہی نہیں تھے

....

عشق یوں تقدیس کے پہلو میں ہے بیٹھا ہوا
جس طرح سے دو دلوں کا رابطہ پہلے سے تھا

غارِ حرا اور نسخۂ کیمیا

جب مَیں نے شریفی صاحب کو فون کر کے بتایا کہ مَیں حج کرنے کے بعد ان دِنوں مکّہ مکّرمہ میں مقیم ہوں تو انھوں نے میرے لیے ایک گاڑی مع ڈرائیور بھیج دی۔ یہ LEXUS گاڑی تھی۔ پاکستانی روپوں میں اس کی قیمت شاید پونے چار کروڑ ہوگی۔ان کا ڈرائیور اسلم گاڑی لے کر آ گیا تو مَیں نے اپنے دوست عارف انجم اور ان کی بیگم صاحبہ کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ ہمارا پروگرام تھا کہ پہلے مکّہ مکّرمہ کے خاص مقامات کی زیارت کر لی جائے چنانچہ اسلم نے پہلی بریک غارِ حرا کے قریب جا کر لگائی۔

غارِ حرا،جبلِ نور کی چوٹی پر واقع ہے۔ یہ مکّہ مکّرمہ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ وہی غار ہے،جس کے بارے میں مولانا حالی نے کہا تھا:

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

عارف انجم صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ چونکہ بڑھاپے کی منزل پر قدم دھر چکے ہیں اِس لیے غارِ حرا کی اونچائی دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے۔ٹیڑھی میڑھی بارہ سو سیڑھیاں چڑھنا کوئی آسان کام ہے؟ یہ سیڑھیاں دیکھ کر ان کے دِل میں یہ خیال تو ضرور ہی آیا ہوگا کہ ہمارے نبی حضرت محمدؐ کس طرح غارِ حرا تک پہنچتے رہے ہوں گے؟ اکیلا ہوتا تو مَیں اِس بار بھی ضرور غارِ حرا کے اندر تک جاتا۔ دو نفل ادا کرتا اور چشمِ تصور سے تلمیذ الرحمن کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سامنے دو زانو

تشریف فرما دیکھتا، چونکہ ابھی حجاج کرام کی بڑی تعداد مکّہ مکرّمہ میں موجود تھی اس لیے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نہایت خشوع وخضوع سے غارِ حرا کی طرف جاتی دکھائی دی۔ غارِ حرا کی زیارت اگرچہ حج اور عمرے کا حصہ نہیں،لیکن بیش تر لوگ جو پہلی بار حج یا عمرہ کرنے آتے ہیں، غارِ حرا تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، کچھ کامیاب ہوجاتے ہیں اور کچھ تھک کر واپس آجاتے ہیں۔

اگلی منزل جبلِ ثور تھی۔ جبلِ ثور مِسفلہ کے قریب واقع ہے۔اس کی اونچائی تقریباً 4610 فٹ ہے۔ غارِ ثور میں ہمارے پیارے رسول حضرت محمدؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ اُس وقت پناہ لی تھی جب قریشِ مکّہ آپؐ کے پیچھے تلواریں لے کر پھر رہے تھے۔عارف انجم اور ان کی بیگم صاحبہ کے بڑھاپے نے مجھے غارِ ثور تک پہنچنے سے بھی روک لیا۔ویسے بھی یہ غار، غارِ حرا سے زیادہ بلند ہے۔شاید میرے دِل کے کسی گوشے میں بھی بلندی کا خوف موجود تھا۔سو ڈرائیور اسلم نے گاڑی کا رُخ میدانِ عرفات کی طرف موڑ دیا،لیکن مَیں نے دِل میں عہد کرلیا کہ اگر آئندہ بلاوا آیا تو غارِ ثور تک ضرور پہنچوں گا۔

ویرانی سی ویرانی

میدانِ عرفات پہنچے تو یہ دیکھ کر شدید حیرانی ہوئی کہ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔کوئی چیز بھی دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ ابھی چند روز پہلے یہاں لاکھوں لوگ جمع تھے۔حج کے روز یہاں قیامت کا سماں تھا۔ ہر طرف لاتعداد خالی بوتلیں، جوس کے ڈبے، بریانی کے خالی پیکٹ، پھلوں کے چھلکے اور ڈسپوزل گلاس اور پلیٹیں تھیں۔اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔البتہ حجاج کرام کے لیے بنائے گئے خیمے اِسی طرح قائم تھے اِن خیموں سے ایک ایک چیز سمیٹ لی گئی تھی۔لگتا ہی نہیں تھا کہ

ابھی چند روز پہلے یہاں بیس لاکھ سے زیادہ لوگ موجود تھے۔ہم منیٰ،مزدلفہ اور مسجدِ نمرہ بھی گئے۔وہاں بھی وہی ہُو کا عالم تھا۔ڈرائیور نے ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ نہر زبیدہ ہے۔مَیں نے اُدھر دیکھا تو پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ ایک دیوار دکھائی دی۔واقعی یہ کسی نہر کے آثار تھے۔واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ کو پتا چلا کہ حج کے دِنوں میں حاجیوں کو پانی کی قلت کا سامنا رہتا ہے تو اُس نے پتا کروایا کہ مکّہ مکرّمہ کے اردگرد وافر پانی کہاں میسّر ہے؟ اُسے بتایا گیا کہ طائف اور وادیٔ نعمان میں پانی موجود ہے، چنانچہ اُس نے طائف اور وادیٔ نعمان کے چشموں سے مکّہ مکرّمہ تک ایک نہر بنوائی۔ اِس نہر سے لاکھوں انسانوں اور جانوروں نے پانی پیا۔ اِس نہر کو نہر زبیدہ کہا جاتا ہے۔اب اس میں پانی نہیں بہتا،لیکن خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ کے کام کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔اِس نہر کی کھدائی مسلسل تین سال تک ہوتی رہی، ہزاروں مزدوروں نے دِن رات کام کیا۔ ملکہ نے تقریباً 70 لاکھ دینار نہر کی تعمیر پر خرچ کیے۔کہتے ہیں کہ جب ملکہ کو نہر کا کام مکمل ہونے پر سارا حساب پیش کیا گیا تو وہ دجلہ کے کنارے اپنے محل میں تھی۔ اُس نے حساب کے کاغذات پر نظر ڈالے بغیر کہا کہ انھیں دریا میں پھینک دیا جائے۔مَیں نے یہ کام اللہ کے لیے کیا ہے اِس میں حساب کیسا؟

اسلم کی زبانی یہ واقعہ سُن کر مجھے اُردو کی کہاوت ''نیکی کر دریا میں ڈال'' یاد آ گئی۔کہیں یہ کہاوت ملکہ زبیدہ ہی کی عطا تو نہیں؟

طائف کا سفر

عارف انجم صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ بھی طائف جانے کی آرزو مند

تھیں لیکن وہ اِس لیے نہیں جا سکتے تھے کہ اُن کے پاس ان کے پاسپورٹ نہیں تھے۔میرے پاس تھا۔سو اُن دونوں کو ان کے ہوٹل چھوڑا اور ہم طائف کی طرف چل پڑے۔گاڑی ہائی وے پر پہنچی تو بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔شہر سے نکلتے ہی ایک پولیس چیک پوسٹ آئی۔یہاں تک تو ساری گاڑیاں مقررہ رفتار سے سفر کرتے ہوئے آتی ہیں،لیکن یہاں سے نکلتے ہی فراٹے بھرنے لگتی ہیں۔میرا ڈرائیور اسلم قانون کا پابند دکھائی دیتا تھا۔اُس نے رفتار کی مقررہ حد عبور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ایک جگہ ہائی وے پر دو تین گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں،اُن گاڑیوں کے ڈرائیور،اپنی گاڑیوں کی نمبر پلیٹوں سے کچھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔میرے پوچھنے پر اسلم نے بتایا کہ یہ عرب امیر زادے ہیں۔مقرر حد سے تیز گاڑیاں چلانے کے عادی ہیں،لیکن چاہتے ہیں کہ کیمروں کی زد میں نہ آئیں اِس لیے اپنی گاڑیوں کی نمبر پلیٹوں پر ٹیپ چسپاں کر رہے ہیں۔اگلی چیک پوسٹ تک پہنچنے سے پہلے یہ ٹیپ اُتار دیں گے۔ اپنا شوق بھی پورا کر لیں اور قانون کی نظر میں بھی نہیں آئیں گے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر مضبوط اور بارسوخ لوگ تو اتنا تکلف بھی نہیں کرتے۔وہ مقرّر رفتار سے تیز گاڑیاں چلاتے ہیں، پکڑے جائیں تو پولیس اہل کاروں کی کسی سے بات کرواتے ہیں اور چھوٹ جاتے ہیں۔عرب امیر زادوں اور شیوخ کے لیے قانون مذاق ہے۔البتہ ہم پاکستانیوں، بنگلا دیشیوں اور بھارتیوں کو یہ پولیس اہل کار ہرگز نہیں چھوڑتے۔لگتا ہے کہ سارے قانون صرف ہمارے لیے بنائے گئے ہیں۔

طائف کا سارا راستا پہاڑوں کو چیر کر بنایا گیا ہے۔اِردگرد سرسبز درخت نظر آتے ہیں۔اسلم نے ایک جگہ گاڑی روکی۔ دروازہ کھول کر ہم دونوں باہر آ گئے۔ہمارے سامنے بہت بلندی پر بہت بڑا پہاڑ تھا۔اسلم نے اُس کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''ہم سپرنگ کی طرح گھومتی ہوئی سڑک پر سفر کرتے ہوئے اُس پہاڑ تک پہنچیں گے۔یہی طائف ہے''۔حیرت نے ایک بار پھر میرا دامن تھام لیا۔مَیں چشمِ تصور سے دیکھ رہا تھا کہ میرے پیارے نبی حضرت محمدؐ پیدل ہی اس اونچے پہاڑ کی طرف جا رہے ہیں۔پھر جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو وہاں کے لوگ ان کا استقبال کرنے کے بجائے اُنھیں ایذائیں دے رہے ہیں۔پتھر مار رہے ہیں۔مذاق اُڑا رہے ہیں۔آپ کا بدن لہولہان ہے،لیکن آپؐ ان کے لیے ہدایت کی دُعا مانگ رہے ہیں۔اللہ اللہ! یہ صبر، برداشت اور تحمل ہی ہے جس نے میرے نبیؐ کو کامیابی عطا کی۔ کہتے ہیں کہ انگور کی فصل کو خون کھاد کے طور پر دیا جاتا ہے۔ طائف کی زمین نے میرے نبیؐ کے خون کا ذائقہ چکھا ہے شاید اِسی لیے آج بھی طائف میں انگور کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے اور جیسا میٹھا انگور طائف میں ہوتا ہے شاید ہی کسی اور خطے میں ہوتا ہوگا۔

طائف یا اسلام آباد؟

طائف کی طرف جاتے ہوئے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے مَیں اسلام آباد سے مری کی طرف جا رہا ہوں۔کئی مقامات پر بھورے رنگ کے پہاڑی بندروں کے غول کے غول دکھائی دیے۔لوگ رُک رُک کر کھانے کی چیزیں انھیں دے رہے تھے۔ چندمنٹ کی مسافت کے بعد ہم طائف کے اندر داخل ہو گئے۔یہاں کئی نہایت شان دار فیملی پارک نظر آئے۔آخر ایک پارک کے سامنے اسلم نے گاڑی روک لی۔نہایت وسیع وعریض رقبے پر بنایا گیا یہ پارک بالکل خالی تھا۔اسلم نے بتایا کہ ان پارکوں میں عرب لوگ چھٹی کے دن اپنی فیملیز کے ساتھ آتے ہیں اور پورا دن گزارنے کے بعد واپس لوٹ جاتے ہیں،لیکن یہاں ہمارے پاکستانی پارکوں

کی طرح کبھی ہجوم نہیں ہوتا۔اس پارک میں چھوٹی چھوٹی عالی شان جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جن پر نمبر لگے ہوئے تھے۔اسلم نے بتایا کہ اگر کوئی فیملی طائف میں رات گزارنا چاہے تو معمولی رقم ادا کر کے یہ جھونپڑی کرائے پر حاصل کرسکتی ہے۔

جب ہم روانہ ہوئے تھے تو مکّہ مکّرمہ کا درجہ حرارت تقریباً 44 سینٹی گریڈ تھا لیکن طائف کا درجہ حرارت صرف 20 سینٹی گریڈ تھا۔پہلے تو مجھے یقین نہ آیا لیکن جب سڑک کنارے جاتے ہوئے شخص کو گرم جیکٹ پہنے دیکھا تو یقین آ گیا۔کئی عرب اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ سڑک کے کنارے گرین بیلٹ پر بیٹھے کچھ کھاتے پیتے نظر آئے۔

طائف ایک ماڈرن شہر

طائف ایک ماڈرن شہر ہے اس لیے یہاں فیملیز کے لیے وہ قوانین نرم پڑ جاتے ہیں جو مکّہ مکّرمہ اور مدینہ منّورہ میں پوری طرح لاگو ہوتے ہیں۔یہاں عرب خواتین نقاب کے بغیر دکھائی دیتی ہیں۔اسلم نے بتایا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے اگر کوئی عرب خاتون بغیر نقاب کے کہیں نظر آ جاتی تو مرد اُن کے سَروں پر چھڑی سے ضرب لگاتے تھے۔اب ایسا کچھ نہیں ہوتا۔اس شہر کے ماڈرن ہونے کا مزید یقین تب آیا جب ہم ایک ریسٹورنٹ میں گئے، وہاں تین نوجوان بیٹھے تھے اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی وہ پردے سے آزاد تھی۔برقع تھا نہ نقاب، یہ چاروں لوگ ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔غیر ملکی بھی نہیں تھے،عرب تھے۔عرب نوجوانوں کو اس طرح اکٹھے بیٹھے مَیں نے پہلی بار دیکھا تھا اس لیے بہت حیرت ہو رہی تھی۔گویا عرب معاشرہ مصلحت اور منافقت کی قید سے رفتہ رفتہ آزاد ہو رہا ہے۔عورت کے معاملے میں ان کے رویے خاصے پریشان کن

ہیں۔آپ یہ جان کر حیران ہوں گے مکّہ مکّرمہ جیسے شہر میں کئی مقامات پر لکھا ہوا ہے کہ اگر آپ کسی خاتون کے ساتھ ٹیکسی میں سفر کرنا چاہتے ہیں تو پہلے خود سوار ہوں، خاتون کو اپنے بعد بیٹھنے کو کہیں اور جب اُترنے لگیں تو پہلے خاتون کو اُتاریں۔سُنا ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور خواتین کو بھگا لے جاتے ہیں اور اسلم کی زبانی یہ بات سُن کر تو بہت دھچکا لگا کہ عرب لوگ اپنی بیگمات کو اپنے بھائیوں کے گھروں پر بھی تنہا چھوڑنے کے روادار نہیں،عورت سڑک پر اکیلی جا رہی ہو تو گاڑی اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔یہ رویّہ کسی گھٹن کا نتیجہ ہی ہوسکتا ہے۔طائف میں مردوں اور عورتوں کو کسی حد تک آزاد دیکھ کر دِل کو خوشی ہوئی کہ سعودی معاشرے میں تبدیلی آ رہی ہے۔

طائف کے پھل

آدمی طائف جائے اور پھل نہ خریدے۔یہ ممکن ہی نہیں،سو ہم بھی ایک فروٹ مارکیٹ پہنچے جہاں نہایت سلیقے سے موسمی اور بے موسمی پھل رکھے ہوئے تھے۔تازہ انجیر، انگور، آم، کیلے، انار، سیب، ناشپاتی، امرود، خوبانی، آلو بخارا ہر پھل موجود تھا، ہم نے تازہ انجیر خریدی اور کھائی۔ایسی انجیر شاید مجھے دوبارہ طائف ہی میں مل سکے گی۔

رات کے آٹھ بجے تک طائف ہی میں تھے۔ایک جگہ سڑک کے کنارے اسلم نے گاڑی روک دی اور بولا: ''نیچے دیکھیے!'' کیا منظر تھا! نیچے روشنیاں ہی روشنیاں تھیں،ہم ہزاروں فٹ اوپر کھڑے تھے۔یوں لگ رہا تھا جیسے ہوائی جہاز سے زمین کا نظارہ کر رہے ہیں۔ہاں یاد آیا۔اسلم نے جیسے ہی گاڑی روکی، دیکھا کہ سڑک کنارے ایک شخص اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ہماری

مہنگی گاڑی دیکھ کر وہ سمجھا کہ کوئی عیاش اور آوارہ عرب اُدھر آ گیا ہے۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور ہماری طرف آیا، لیکن جب اُس نے میرا معصومانہ چہرہ دیکھا تو لوٹ گیا۔ اسلم بولا: ''اگر ہم پاکستانی، عرب نوجوانوں جیسی کوئی حرکت کریں گے تو فوراً پکڑے جائیں گے۔ معافی بھی نہیں ملے گی''۔

مجھے یہ شعر یاد آ گیا:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

❁❁❁

طواف کا سلسلہ قیامت تلک رہے گا

j

دُنیا کی ہر چیز اپنے مدار کے گرد گھومتی ہے۔ جب تک وہ اپنے مدار میں رہتی ہے، سلامت رہتی ہے جونہی مدار سے ہٹتی ہے، سب کچھ بکھر جاتا ہے۔ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے لوگوں کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ پہیّا اپنے ایکسل کے گرد گھوم رہا ہے۔ ہماری کائنات میں سیارے بھی تو اِنھی طواف کرتے لوگوں کی طرح سورج کے گرد مسلسل محوِ سفر ہیں۔ جس دن کسی سیارے نے راستا بدلا، اسی دن یہ سارا نظام تلپٹ ہو جائے گا۔

کڑک چائے اور سرخ مٹی

طائف سے واپسی اگرچہ رات گئے ہوئی تھی، لیکن تھکاوٹ کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو بہت ہشاش بشاش تھا۔ فجر کی نماز اپنے ہوٹل کے پچھواڑے میں واقع مسجد خدیجہ بنت خویلدؓ میں ادا کی۔ اس کے بعد کچھ وقت کمرے میں گزارنے کے بعد خانہ کعبہ جا پہنچا۔ اپنے دو بچوں جواد اور ارفع کی طرف سے طواف کیا۔ ظہر کی نماز میں چونکہ ابھی کافی وقت باقی تھا، چنانچہ مَیں نے کلاک ٹاور میں ملازمت کرنے والے اپنے ایک نئے دوست امین صاحب کو فون کیا۔ ان سے بات ہوئی تو اُنھوں نے نہایت خوش دلی سے بات کی اور فوراً میرے پاس پہنچ گئے۔ امین صاحب کلاک ٹاور میں پلمبر ہیں۔ تعلق فیصل آباد سے ہے۔ پہلے تو اُنھوں نے اس چائے خانے سے مجھے گرما گرم مِکس چائے پلائی جہاں سے کلاک ٹاور میں کام کرنے والے سارے ملازم پیتے ہیں۔ حج اور عمرہ کرنے والے اکثر لوگ ٹی بیگ والی چائے پیتے ہیں، مِکس چائے ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ امین صاحب نے بتایا کہ اگر آپ دکان دار سے کہیں کہ کڑک چائے بنا دیں تو وہ آپ کو مکس چائے دے دے گا۔ گویا مِکس چائے کو یہاں کڑک چائے کا نام دیا گیا ہے۔ یہ انکشاف اگر مجھ پر پہلے ہو جاتا تو شاید میری وجہ سے بہت سوں کا بھلا ہو جاتا۔

چائے پلانے کے بعد امین صاحب مجھے کلاک ٹاور کی گیارہویں منزل پر لے گئے، جہاں ملازمین اور خریداروں کے لیے ایک بہت بڑی مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس میں مسجد الحرام کی امامت ہی میں نماز ادا کی جاتی ہے، سو ہم نے بھی ظہر کی نماز یہیں ادا کی۔ گیارہویں منزل کی کھڑکی سے دیکھا تو وہاں سے خانہ کعبہ بہت صاف دکھائی دیتا تھا۔ نیچے چلتے پھرتے لوگ بالشتیے لگ رہے تھے۔ اس کھڑکی سے باب فہد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے امین صاحب نے ایک جگہ کی نشان دہی کی اور بولے: ''ادھر دیکھیے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسلام سے پہلے عرب اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کردیا کرتے تھے۔ حرم کے اردگرد تمام مقامات پختہ سیمنٹ، بجری اور خاص چمک دار پتھر سے بنائے گئے ہیں، لیکن صرف اسی مقام پر آپ کو سرخی مائل مٹی نظر آئے گی، کیونکہ یہاں جب بھی کوئی دیوار یا عمارت کھڑی کرنے کے لیے بنیادیں کھودی جاتی ہیں تو نیچے سے انتہائی سرخ مٹی نکل آتی ہے۔ لگتا ہے کہ یہ مٹی نہیں، انسانی گوشت کے لوتھڑے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں عربوں نے کتنی لڑکیوں کو زندہ درگور کیا ہوگا؟''

امین صاحب بہت دکھ سے بولتے رہے۔ وہ مزید بولے: ''ہمارے دین نے عورتوں کو بہت حقوق دیے ہیں، لیکن عربوں نے آج بھی عورتوں کو استعمال کی چیز بنا رکھا ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ آج بھی جب عربوں کے گھروں میں کوئی محفل یا دعوت ہوتی ہے تو پہلے مرد کھاتے ہیں اور بچا کھچا عورتوں کے آگے رکھ دیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے عرب اپنی خواتین کو منوں مٹی تلے دبا دیتے تھے، اب اُنھیں اپنے پُرآسائش محلات کی غلام گردشوں میں محصور رکھ کر مار دیتے ہیں۔

خانہ کعبہ، دنیا کا مدار

مغرب کی نماز کے بعد مَیں خانہ کعبہ کے عین روبرو بیٹھ گیا اور طواف کرنے والے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ خانہ کعبہ کے اوپر مجھے ایک بار پھر ابابیلیں دکھائی دیں۔ میرے دِل میں عجیب سے خدشات آنے لگے۔ یہ ابابیلیں مجھے بار بار کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟ اللہ خیر کرے! پھر مجھے یاد آیا کہ خانہ کعبہ دنیا کے عین مرکز میں واقع ہے۔ مرکز مضبوط ہوتو اردگرد کا سارا ڈھانچہ مضبوط رہتا ہے۔ جس طرح بائیسکل کا پہیّا اپنے ایکسل کے گرد گھومتا ہے، اسی طرح دُنیا کی ہر چیز اپنے مدار کے گرد گھومتی ہے۔ جب تک وہ اپنے مدار میں رہتی ہے، سلامت رہتی ہے جونہی مدار سے ہٹتی ہے، سب کچھ بکھر جاتا ہے۔ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے لوگوں کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ پہیّا اپنے ایکسل کے گرد گھوم رہا ہے۔ ہماری کائنات میں سیارے بھی تو اِنھی طواف کرتے لوگوں کی طرح سورج کے گرد مسلسل محوِ سفر ہیں۔ جس دن کسی سیارے نے راستا بدلا، اسی دن یہ سارا نظام تلپٹ ہوجائے گا۔ مجھے اسلم انصاری کا یہ شعر یاد آ گیا:

کبھی شورِ قیامت گوشِ انساں تک بھی پہنچے گا
کوئی سیّارہ بدلے گا مدار آہستہ آہستہ

اب میری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ خانہ کعبہ کے گرد ہر لمحہ طواف کیوں جاری رہتا ہے؟ جس روز یہ طواف رک گیا، وہ روز، روزِ قیامت ہوگا۔

مسجد جعرانہ

یکم اکتوبر کو نمازِ فجر، خانہ کعبہ میں ادا کرنے کے بعد مجھے عارف انجم کے ہوٹل

میں پہنچنا تھا۔ اُنھوں نے مسجد جعرانہ سے احرام باندھ کر عمرہ کرنے کی نیّت باندھی تھی۔ اس ارادے میں ان کی بیگم اور کچھ دیگر حاجی صاحبان بھی شامل تھے۔ مجھے بھی ازراہِ محبت، اس قافلے میں شامل کرلیا گیا تھا۔ مسجد جعرانہ مکّہ مکرّمہ سے تقریباً چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر طائف ہائی وے پر واقع ہے۔ یہ طائف سے آنے والوں کے لیے حدودِ حرم کا نقطۂ آغاز ہے اور اسے میقات کا درجہ حاصل ہے۔ طائف سے آنے والے تمام لوگ اسی مسجد میں احرام باندھتے ہیں۔ ہمارے نبی حضرت محمدؐ نے بھی طائف سے واپسی پر اسی مقام پر احرام باندھا تھا۔ پاکستان اور دنیا کے دیگر ملکوں سے آنے والے حجاج کرام اور معتمرین ایک مرتبہ مکّہ مکرّمہ کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اگر دوبارہ عمرہ کرنا چاہیں تو احرام باندھنے اور عمرے کی نیّت کرنے کے لیے ان کے پاس دو آسان راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مسجد الحرام سے صرف دو ریال ادا کر کے شٹل بس سروس میں سوار ہوں اور مسجد عائشہ پہنچ جائیں یا خاص طور پر ٹیکسی لے کر چوبیس کلومیٹر دور مسجد جعرانہ چلے جائیں۔ بیشتر لوگ مسجد عائشہ میں جا کر احرام باندھتے ہیں، کیونکہ وہاں پہنچنا ان کے لیے آسان ہوتا ہے۔ عارف صاحب نے مسجد جعرانہ پہنچنے کے لیے ایک ہائی ایس وین کا بندوبست کر رکھا تھا، لیکن جب ناشتہ کیئے ہوئے کافی وقت ہوگیا اور وین نہ آئی تو مَیں نے سوچا کہ کیوں نہ سامنے ہی واقع جنّت المعلیٰ کی زیارت کر آؤں۔ جنّت المعلیٰ مکّہ معظّمہ کا خاص قبرستان ہے، لیکن جنّت البقیع کو اس قبرستان پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ خانہ کعبہ سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، لیکن گرینڈ مکّہ ہوٹل کے عین سامنے تھا، جس میں عارف انجم اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس قبرستان میں حضور پاکؐ کے رشتے داروں، اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور بہت سے صحابہ کرامؓ کے مزاراتِ مقدسہ ہیں۔

مکّہ مکرّمہ میں فوت ہو جانے والے حجاج کرام کو اسی قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے۔

جنّت المعلّٰی

قبرستان کے اندر پہنچا تو اپنے نام کی طرح جنّت ہی لگا۔ صفائی ستھرائی کے لیے عملہ ہر دم مستعد تھا۔ زمین پر کہیں کوئی کاغذ کا ٹکڑا تک نظر نہیں آیا۔ اگر کوئی حاجی جوس کی بوتل یا کھانے پینے کے سامان کا خالی پیکٹ اِدھر اُدھر پھینک دے تو وہاں موجود صفائی پر مامور عملہ فوراً اُٹھا کر کوڑے کرکٹ کے لیے رکھے گئے ڈرم میں ڈال دیتا ہے اور آپ سے کوئی گلہ بھی نہیں کرتا۔ وہ چپ چاپ خدمت کرتے ہیں اور اگر کوئی حاجی چپ چاپ ان کی ''خدمت'' کر دے تو نہایت محبت اور احترام کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مَیں نے عملے کے ایک شخص کو مخاطب کیا اور بولا: ''مَیں جنّت المعلّٰی کی تھوڑی سی مٹی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟'' وہ شخص اگرچہ انڈین تھا، لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان تھا، کیونکہ حرم کی حدود میں کسی غیر مسلم کو آنے کی اجازت ہی نہیں، اِس لیے اُس نے بکمال مہربانی کہا: ''جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ اگر ان سے بچ کر آپ اُٹھا سکتے ہیں تو اُٹھا لیں۔ مَیں آپ کو منع نہیں کروں گا۔''

اُس کی کشادہ دلی نے میرا دِل جیت لیا۔ مَیں نے پانچ ریال کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ مَیں جنّت المعلّٰی کی درمیانی روش پر چلتے چلتے خاصا آگے نکل گیا، لیکن جہاں سے بھی مٹی اُٹھانے کی کوشش کرتا، سامنے کیمرہ نظر آ جاتا۔ مجھے لاہور کی دیواروں پر لکھی ہوئی عبارت یاد آ گئی ''خبردار کیمرے کی آنکھ آپ کو دیکھ رہی ہے''۔ مجھے دِل ہی دِل میں شرم آئی کہ کیمرے کی آنکھ سے تو مجھے ڈر

لگتا ہے اور اس آنکھ سے بالکل نہیں ڈرتا جو مجھے ہر وقت دیکھتی رہتی ہے۔ پتا نہیں کیوں مَیں نے جنّت المعلّٰی سے مٹی اُٹھانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ مَیں ڈر گیا تھا اُس اللہ سے جو سب کچھ دیکھتا ہے اور معاف کر دینے پر قادر ہے۔

فون کی بیل بجی۔ او کے کیا تو دوسری طرف عارف انجم صاحب تھے۔ اُنھوں نے اطلاع دی کہ ہمیں مسجد جعرانہ لے جانے کے لیے وین آ گئی ہے، سو مَیں تیزی سے چلتے ہوئے اُن کے ہوٹل کے سامنے پہنچ گیا۔ میرے سوار ہوتے ہی وین چل پڑی، تقریباً پندرہ منٹ میں ہم سب مسجدِ جعرانہ پہنچ گئے۔ وضو کیا، احرام باندھا، نیّت کی اور دو نفل ادا کیے۔ اس سارے عمل میں تقریباً بیس پچیس منٹ لگے۔ وہاں سے تقریباً اتنے ہی وقت میں ہم خانہ کعبہ پہنچ گئے۔ عارف صاحب کی بیگم صاحبہ ویل چیئر پر تھیں۔ مَیں نے ان کی ویل چیئر کو دھکیلتے ہوئے طواف کے سات چکر پورے کیے اور وہ سب عمل کیے جو عمرے کے طواف میں ضروری ہوتے ہیں۔ صفا اور مروہ کی سعی بھی مَیں نے ویل چیئر کے ساتھ ہی کی۔ صفا و مروہ کے غالباً آخری چکر میں عارف صاحب کہیں سے آ نکلے اور ایک فرماں بردار شوہر کی طرح اپنی بیگم صاحبہ کی ویل چیئر کو دھکیلنے لگے۔ دونوں نے میری قینچی سے اپنے تھوڑے تھوڑے بال کاٹ لیے۔ مَیں ایک نائی کے پاس جا پہنچا اور دس ریال میں ایک بار پھر ٹنڈ کروائی۔ یہ عمرہ مَیں نے اپنے مالک مکان اختر صدیق کی طرف سے کیا تھا، جن کا لاہور میں حج سے چند روز قبل انتقال ہو گیا تھا، جس روز مَیں حج کے لیے لاہور سے روانہ ہوا تھا، اس روز وہ شدید بیمار تھے، لیکن جب مَیں اُنھیں ملنے کے لیے گیا تو وہ بجلی کی سی پھُرتی سے اُٹھے۔ دیر تک میرا ہاتھ تھام کر بیٹھے رہے۔ کچھ بول نہیں پائے۔ انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف انگلی اُٹھا کر وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے، لیکن ان کی آواز حلق ہی میں کہیں اٹک کر رہ گئی تھی۔

غالباً وہ مجھے یہ کہنا چاہتے تھے کہ مَیں حرم شریف میں پہنچ کر ان کے لیے دُعا کروں۔ مجھے یاد ہے کہ مَیں نے جب بھی اپنے کسی عزیز یا دوست سے ان کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ یہ میرے مالک مکان ہیں تو کہتے: ''نہیں جی نہیں! یہ اس گھر کے مالک ہیں۔''

پیدا کہاں ہیں ایسے ''بھلا زندہ'' طبع لوگ

انڈین پروفیسر صاحب

عمرہ ادا کرنے کے بعد جب مَیں نائی کی دکان میں بیٹھا ٹنڈ کروا رہا تھا تو میرے ساتھ والی کرسی پر ایک صاحب ٹنڈ کروا رہے تھے اور ساتھ ساتھ نہایت شستہ اُردو میں نائی سے بات چیت بھی کر رہے تھے۔ وہ کوئی پڑھے لکھے آدمی لگتے تھے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ آپ کا نام عبدالقدوس انصاری ہے۔ بھارت سے تعلق ہے۔ وہاں ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ پی ایچ۔ڈی کر چکے ہیں۔ جب ہم دونوں فارغ البال ہو چکے تو مَیں نے ان سے گفتگو شروع کر دی۔ مَیں ان سے سوال کرتا گیا اور وہ جواب دیتے گئے۔ ہم دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ درج ذیل ہے:

☆...... انصاری صاحب! سب سے پہلے مَیں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں کہ اتنے متبرک مقام یعنی مکّہ مکرّمہ میں ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔ اپنا کچھ تعارف کروا دیجیے۔

O...... مَیں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہم اس وقت پوری دُنیا کا حصہ ہیں۔ یہاں ہم ساری دنیا بالخصوص عالم اسلام کی بہبود کے لیے دُعا کرتے ہیں۔ میرا نام ڈاکٹر عبدالقدوس انصاری ہے۔ بہار میں تاریخ پڑھاتا

ہوں۔ بدھ ازم میرا خاص مضمون ہے۔

☆...... حج کے انتظامات کے حوالے سے آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

O...... سچی بات یہ ہے کہ مَیں یہاں ہر لحاظ سے مطمئن ہوں۔ البتہ پاکستانی نوجوانوں کی خدمات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ حج کے دِنوں میں مجھے مکّہ مکرّمہ کے ہر چوک اور ہر سڑک پر پاکستانی نوجوان دکھائی دیے جو بلاتفریق ہر حاجی کی راہ نمائی کر رہے تھے۔ یہ توفیق صرف پاکستانیوں ہی کو حاصل ہوئی کہ اُنھوں نے اللہ کے مہمانوں کی قدم قدم پر راہ نمائی کی۔ بھارت اور بنگلہ دیشی حاجیوں کی بھی یہاں بڑی تعداد آتی ہے، لیکن مجھے بھارتی اور بنگلا دیشی لوگ پاکستانیوں کی طرح خدمت کرتے دکھائی نہیں دیے۔ میں نے کئی لوگوں کو دیکھا جو اپنے ہوٹل سے نکلے اور راستہ بھول گئے۔ اُنھیں پاکستانی لوگ راستہ دکھاتے، ان کے ہوٹلوں تک پہنچاتے۔ خدمت کا یہ انداز مَیں نے کسی اور ملک کے لوگوں میں نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ نقشے لے کر کھڑے تھے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ دوسرے ملکوں کے لوگوں کو بھی حج کے موقع پر اپنے رضا کار یہاں بھیجنا چاہئیں۔ اگر یہ لوگ آپ کی سرکار نے بھیجے تھے، تب بھی ٹھیک ہے اور اگر آپ کے پرائیویٹ حج آرگنائزر نے ان کا بندوبست کیا تھا تو بھی درست ہے۔

انصاری صاحب سے ابھی میری بات چیت جاری تھی کہ ان کی بیگم صاحبہ آن پہنچیں۔ اُنھوں نے اللہ جانے کیا اشارہ کیا کہ پروفیسر صاحب گفتگو ادھوری چھوڑ کر جلدی سے ان کے ساتھ چلتے بنے اور مجھے اپنے ایک دوست کی بات یاد آ گئی جو کہتے ہیں کہ پروفیسر کہیں کا بھی ہو، پروفیسر ہی ہوتا ہے پرنسپل سے بھی ڈرتا ہے اور بیوی سے بھی۔

چیزیں سستی ہوگئیں

واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو کچھ دیر آرام کے بعد کھانے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سڑکوں پر حاجیوں کی بجائے عربی گھومتے نظر آئے۔ ایک پاکستانی ہوٹل پہنچا تو اُنھوں نے بتایا کہ اب پاکستانی کھانا نہیں ملے گا۔ وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ تمام حاجی صاحبان واپس چلے گئے ہیں۔ سُن کر بہت حیرت ہوئی، کیونکہ ہم ابھی تک یہیں تھے۔ عربی کھانوں میں مجھے فول تمیز اور قلابہ پسند ہے۔ فول تمیز اور قلابہ دراصل حلیم کی عربی شکل ہے۔ مختلف دالیں ملا کر یہ ایک بڑی دیگ میں رات بھر تیار کیا جاتا ہے۔ عربوں کی دیگ ہماری دیگ سے الگ ہے۔ اس کا منہ بمشکل اتنا ہوتا ہے کہ آسانی سے ایک بڑا چمچہ اندر جاسکتا ہے۔ دکاندار بہت مہارت سے اتنے تنگ دہانے سے فول تمیز یا قلابہ نکالتا ہے اور ایک ڈسپوزایبل پلیٹ میں نہایت سلیقے سے ڈال کر آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر زیتون کا تیل ڈال دیا جاتا ہے۔ گرما گرم روٹی سے یہ اور زیادہ مزے دار لگتا ہے۔ زیتون کا تیل آپ مزید ڈالنا چاہیں تو دکاندار آپ کو دو چار چھوٹے ساشے دے دیتا ہے۔

میرے ہوٹل کے ساتھ ہی ایک عمارت، جس پر ''فنون السیّدات'' لکھا ہوا تھا، میں اب برقع پوش عرب خواتین کی آمدورفت کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ ایک بیوٹی پارلر تھا۔ یہ خواتین میک اپ کرکے پتا نہیں کہاں جاتی ہیں؟ مکّہ مکرّمہ کی دکانوں پر خواتین کے بہت ماڈرن ملبوسات بھی فروخت ہوتے ہیں، لیکن مَیں نے کسی خاتون کو یہ لباس پہنے نہیں دیکھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ عرب خواتین یہ لباس پہن کر گھر سے باہر نکلیں تو اس کے اوپر برقع پہن لیتی ہیں، البتہ گھروں کی چار دیواری میں وہ اپنی مرضی کا لباس پہنے رہتی ہیں۔

میرے ہوٹل کے ساتھ والی بلڈنگ پر، جہاں سے ہر آدھے گھنٹے کے بعد حرم شریف کے لیے بس روانہ ہوتی تھی، نوٹس لگا دیا گیا تھا کہ بسوں کی فری سروس ختم کر دی گئی ہے۔ سبب اس کا وہی تھا کہ بیش تر حاجی صاحبان جا چکے تھے۔ جو چند ایک ہم جیسے لوگ رہ گئے تھے، وہی سڑکوں پر گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے وقتی طور پر فری بس سروس کے بند ہونے کا افسوس ہوا، لیکن جب اگلے روز حرم شریف جانے کے لیے ٹیکسی روکی اور کرایہ پوچھا تو ڈرائیور نے صرف دس ریال مانگے۔ حاجیوں کا رش ہو تو ہر چیز کے دام دوگنا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت مزید حیرت ہوئی جب بیکری سے ڈبل روٹی کا پورا پیکٹ ایک ریال میں مل گیا۔ اس پیکٹ میں آدھ درجن ڈبل روٹیاں تھیں۔ اس سے پہلے یہی بیکری والا یہ پیکٹ پانچ ریال میں فروخت کرتا رہا تھا۔ یہ ڈبل روٹی بالکل پھیکی ہوتی ہے ناشتے میں شہد سے کھائیں تو بہت مزہ دیتی ہے۔

میں کر رہا ہوں اَدا، لغزشوں کا کفّارہ

k

پھر وہی سات چکر، استلام، رمل، دو نفل، آبِ زم زم کے دو گھونٹ، صفا و مروہ کی سعی اور حلق، لیجیے جناب ایک اور عمرہ ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ آج بار بار عمرہ ہی کرتا رہوں۔ پھر بلاوا آئے یا نہ آئے، یہ تڑپ یہ شوق رہے نہ رہے لیکن سچ یہ ہے کہ اللہ وہ محبوب ہے جو اپنے عشق کی آگ کو سرد ہونے ہی نہیں دیتا، جو ایک بار اس کے گھر کو چھو لے، دیکھ لے، بار بار اسے چھونے اور دیکھنے کی خواہش کرتا ہے۔

دَم کیا ہے؟

راول پنڈی میں مقیم میرے ایک نادیدہ دوست ڈاکٹر خالد محمود نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ مکّہ مکرّمہ سے واپس آنے سے پہلے ایک دَم دے دیجیے گا"۔ دَم سے مراد پوری بھیڑ، بکری یا گائے اور اونٹ کا ساتواں حصہ حدودِ حرم میں ذبح کر کے صدقہ کرنا ہے۔ دَم دینے والا جانور کا گوشت خود نہیں کھا سکتا، حرم کی حدود سے باہر ذبح کرنے یا جانور کی قیمت ادا کرنے سے دَم ادا نہیں ہوتا، البتہ اگر اپنی غلطی بروقت درست کر لی جائے تو دَم واجب نہیں رہتا۔ دَم جلد از جلد ادا کرنا افضل ہے لیکن موت سے پہلے پہلے ادا کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود صاحب کا کہنا تھا کہ ہر حاجی سے کسی نہ کسی مقام پر کوئی نہ کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے اس لیے واپس آنے سے پہلے دَم دے دینا چاہیے، چنانچہ میں نے سوچ لیا تھا کہ جانے سے پہلے دَم ضرور دوں گا۔ دَم دینے کی روداد نہایت دلچسپ ہے لیکن اس سے پہلے میں ڈاکٹر خالد محمود صاحب کے بارے مں اپنے پڑھنے والوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ انھوں نے راول پنڈی کے علاقے سیٹلائٹ ٹاؤن میں حج اور عمرہ کرنے والوں کی راہ نمائی کے لیے ایک تربیت گاہ بنا رکھی ہے جہاں کسی سے کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا جاتا، وہ یہ کام کسی جزا کی توقع کے بغیر کر رہے ہیں۔ یہ تربیت گاہ ان کے والدِ گرامی ڈاکٹر ریاض الرحمن نے 1978ء میں قائم کی تھی،

تصویروں، نقشوں، چارٹوں اور آڈیو ویڈیو معاونات کے ساتھ عازمین حج اور معتمرین کرام کو تربیت دی جاتی ہے۔ یہاں سے تربیت پاکر حج یا عمرہ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس تربیت کا فائدہ صرف مذہبی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ مالی طور پر بھی ہوتا ہے کہ عازمین حج اور معتمرین کرام صدقے، دَم اور بدنہ سے بچ جاتے ہیں۔ حج اور عمرے کے دوران میں کوئی سنگین غلطی ہو جائے تو کفارے کے طور پر پوری گائے یا پورا اونٹ حدودِ حرم میں ذبح کرنے کے عمل کو بدنہ کہا جاتا ہے۔

مکّہ مکرّمہ کی بکر منڈی

کلاک ٹاور بلڈنگ میں کام کرنے والے اپنے دوست امین صاحب سے دَم کا ذکر کیا تو کہنے لگے: ''آپ میرے ساتھ کاکیا منڈی چلیے گا، وہیں سے بکرا خریدیں گے، وہیں ذبح کروائیں گے''۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ کاکیا منڈی بکر منڈی کو کہتے ہیں اور یہ حدودِ حرم میں واقع ہے۔ روزانہ ہزاروں لوگ کاکیا منڈی جاتے ہیں اور دَم یا بدنہ دیتے ہیں۔ امین صاحب سمجھے تھے کہ شاید حج کے دوران میں مجھ سے کوئی سنگین غلطی ہوگئی ہے لیکن میں نے انھیں یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ میں مکّہ مکرّمہ کی بکر منڈی دیکھنا چاہتا ہوں، ویسے سچ یہ ہے کہ نادانستگی میں غلطی ہر آدمی سے ہوسکتی ہے، ممکن ہے کہ مجھ سے بھی ہوگئی ہو۔ جان بوجھ کر تو کوئی غلطی نہیں کرتا۔

کاکیا منڈی جانے کا شوق مجھے صبح سویرے حرم شریف لے گیا۔ اپنے چھوٹے بھائی طاہر بشیر اور چھوٹی بہن عامرہ اشفاق اور ان کے اہلِ خانہ کی طرف سے الگ الگ دو طواف کیے اور کلاک ٹاور کی نچلی منزل پر واقع اس چائے خانے کے

سامنے جا پہنچا جہاں سے امین صاحب نے مجھے کڑک چائے پلائی تھی، چونکہ ہماری ملاقات کا وقت پہلے سے طے تھا اس لیے وہ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ صرف پندرہ ریال میں کاکیا منڈی کی ٹیکسی مل گئی۔ چند منٹ کے بعد ہم ایک ویسی ہی بکر منڈی میں کھڑے تھے جیسی کبھی لاہور میں بند روڈ پر شیرا کوٹ کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ حدِ نظر تک جانور ہی جانور دکھائی دے رہے تھے، اونٹ، گائے، بکرے اور دنبے ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ الگ الگ جانور، الگ الگ باڑوں میں رکھے گئے تھے۔ بیوپاری اپنے جانوروں کو بھی سنبھال رہے تھے اور گاہکوں سے بھاؤ تاؤ بھی کر رہے تھے۔ بکروں اور دُنبوں کی قیمت انتہائی مناسب تھی، ساڑھے تین سو سے آٹھ سو ریال تک میں نہایت مناسب سائز کے بکرے اور دنبے دستیاب تھے، امین صاحب نے مجھے چار سو ریال میں ایک بکرا لے دیا، اتنا سستا بکرا خرید کر میں خاصا مسرور تھا۔ میری خوشی دیکھ کر امین صاحب بولے: ''سعودی عرب میں چھوٹا گوشت سستا ہے اور بڑا گوشت مہنگا ہے''۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ کے پاکستانی ہوٹلوں میں مٹن کیوں زیادہ پکتا اور بکتا ہے۔

ذبح خانے کا منظر

بکرا خریدنے کے بعد اگلا مرحلہ اسے ذبح کرنے کا تھا چونکہ امین صاحب ساتھ تھے اس لیے میں بے فکر تھا۔ بکرے کو شاید پتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اس لیے وہ چل نہیں رہا تھا۔ امین صاحب اسے گھسیٹ رہے تھے۔ سامنے ہی ایک نہایت کشادہ، صاف ستھرا اور خوبصورت سلاٹر ہاؤس یعنی ذبح خانہ تھا، یہ پاکستانی ذبح خانوں سے مختلف تھا، یہاں تازہ گوشت کی خوشبو تو تھی لیکن

جانوروں کے فضلے اور دیگر آلائشوں کی ذرا سی بھی بدبو نہ تھی۔ گیٹ پر کھڑے وٹرنری ڈاکٹر نے نظر بھر کے ہمارے بکرے کو دیکھا، جب اس نے اشارہ کیا تو بکرے کو ذبح خانے میں لے جانے کی اجازت ملی، ذبح خانے میں سبز رنگ کی وردیوں میں ملبوس لاتعداد حبشی دکھائی دیے۔ ہر ایک کی کمر سے ایک مضبوط بیلٹ کے ساتھ چمڑے کا بیگ لٹک رہا تھا جس میں بڑی بڑی آب دار چھریاں تھیں۔ وہ بہت مہارت سے بکرے کو زمین پر لٹاتے، دَم دینے والے شخص کا ہاتھ لگواتے کلمہ پڑھ کر اللہ اکبر کہتے اور بکرے کی گردن پر چھری پھیر دیتے۔ ایک وقت میں بیسیوں جانور ذبح کیے جا رہے تھے لیکن مجال ہے کہ ادھر ادھر خون بکھرا ہوا نظر آ جائے۔ صفائی کا قصہ یہ ہے کہ پکے فرش پر جہاں جانور ذبح کیے جا رہے تھے وہاں خندق کی طرح بڑی بڑی نالیاں تھیں۔ سارا خون ان نالیوں سے نیچے چلا جاتا۔ آلائشیں بھی ان بڑی نالیوں میں پھینکی جا رہی تھیں۔ امین صاحب نے بتایا کہ اس ذبح خانے کے نچلے حصے میں ایک بہت بڑا کنٹینر کھڑا ہوا ہے جب یہ آلائشوں اور خون سے بھر جاتا ہے تو اسے وہاں سے ہٹا لیا جاتا ہے اور نیا کنٹینر لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

بکروں کے پائے کہاں جاتے ہیں؟

جانور کو ذبح کرنے کی فیس نہایت معمولی ہے، مجھ سے دس یا بارہ ریال وصول کیے گئے اور وہاں موجود بلدیہ کے ایک اہلکار نے اس کی رسید بھی دی۔ حبشی قصاب کی مہارت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اس نے پانچ منٹ کے اندر بہت صفائی سے بکرے کی کھال اتار کر پاس ہی پڑے ایک بڑے ڈرم میں ڈال دی۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی سے چھری تھامے ہوئے وٹرنری ڈاکٹر آیا اس

نے بکرے کی کلیجی کو ہلکا سا کٹ لگایا اور سر ہلا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ بکرے کا گوشت کھانے کے لائق ہے۔ اگر کلیجی خراب ہو تو بکرے کا سارا گوشت کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میرے سامنے کئی ذبح شدہ پورے پورے بکرے کوڑے کے ڈرموں میں صرف اس لیے پھینک دیے گئے کہ ان کی کلیجی خراب تھی، ذبح ہونے والے بکروں کے پائے بھی کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ عرب بکرے کے پائے نہیں کھاتے لیکن پاکستانی، بھارتی اور بنگلا دیشی لوگ شوق سے کھاتے ہیں اس لیے یہ پائے پاکستانی اور انڈین ہوٹلوں کے مالک نہایت سستے داموں خرید کر لے جاتے ہیں۔ میرے سامنے ایک شخص آیا اس نے غالباً بیس یا تیس ریال بلدیہ کے اہلکار کے ہاتھ پر رکھے اور ڈرم میں موجود سارے پائے بڑے بڑے شاپروں میں ڈال کر چلتا بنا۔ امین صاحب نے بتایا کہ یہ شخص کسی پاکستانی ہوٹل کا مالک ہے۔

میرے بکرے کا گوشت دس منٹ کے اندر تیار ہو گیا، قصاب نے ایک بڑا شاپر لیا اور اس میں ڈال کر میرے حوالے کر دیا۔ امین صاحب نے مشورہ دیا کہ یہ گوشت یہیں کسی مستحق کو دے دیا جائے، لیکن میں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور امین صاحب کے ہوسٹل میں پہنچ گئے۔ ان کی کمپنی بن لادن نے اپنے ملازمین کے لیے اس طرح کے بہت سے ہوسٹل بنا رکھے ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے گئے ہیں ہر کمرے میں چار چار یا چھے چھے لوگ رہتے ہیں ہر کمرے میں لوہے کی دو دو منزلہ چارپائیاں فکس ہیں۔

امین صاحب کی مہربانی

کمرے میں پہنچتے ہی میں نے جان بوجھ کر بھوک لگنے کا نعرہ لگا دیا اور بکرے

کا گوشت پکانے کو کہا لیکن امین صاحب نے یاد دلایا کہ دَم دینے والا شخص گوشت خود نہیں کھا سکتا۔ امین صاحب نے مہمان نوازی کے آداب بے تکلفی سے نبھائے، ان کے فرائی پین میں رات کی دال بچی ہوئی تھی، روٹیاں وہ تندور سے خرید لائے، سلاد کے طور پر پیاز کاٹ لی گئی تھی، اس دعوتِ شیراز کا بہت مزہ آیا لیکن کھانا کھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ دیارِ غیر میں کام کرنے والے لوگ کس طرح پیٹ کاٹ کر اپنے اہل خانہ کے لیے روپے کماتے ہیں، پاکستان میں ان کے اہل خانہ ان سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے ہیں جیسے ریال وہاں درختوں پر اُگتے ہیں۔ یہ نہایت لذیذ کھانا کھانے کے بعد دل ہی دل میں امین صاحب کے رزق میں کشادگی کے لیے دعا کی۔

کھانا کھا چکے تو امین صاحب بولے: ''اب ہم چلیں؟'' انھیں اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا تھا، وہ شارٹ لیو لے کر آئے تھے۔ چلنے لگے تو امین صاحب نے گوشت کا تھیلا بھی ساتھ لے لیا، میں نے تھیلا ان سے لیا اور زمین پر رکھ دیا، ''میں یہ گوشت آپ کے لیے لایا ہوں''۔ انھوں نے انکار کیا اور میں نے اصرار، آخر کار انھوں نے ہار مان لی، ان کی محبت کا میں آج بھی مقروض ہوں۔

امین صاحب کی دال کھا کر مجھے فیصل آباد میں گزارے ہوئے دو سال یاد آ گئے، یہ 1988ء کی بات ہے، میں روزنامہ ''عوام'' میں سب ایڈیٹر تھا اور ماہانہ اٹھارہ سو روپے تنخواہ پاتا تھا اور گورنمنٹ کالج دھوبی گھاٹ (آج کل گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد) میں ایم اے اردو کا طالب علم تھا۔

اس اخبار میں مجھے تین کاتب ملے ہوئے تھے جو میرے دیکھے ہوئے مضامین اور نظمیں غزلیں کتابت کیا کرتے تھے۔ یہ تینوں جڑانوالہ کے قریب واقع ایک گاؤں سے آیا کرتے تھے۔ ہم چاروں ہر روز چنیوٹ بازار کے ایک ہوٹل سے

پانچ روپے میں دال کا ایک پیالہ منگواتے، اس کے ساتھ دو روٹیاں مفت ملتی تھیں، ان دنوں روٹی پچاس پیسے کی ہوا کرتی تھی اس لیے باقی چھے روٹیاں ہم اضافی تین روپے دے کر منگوا لیا کرتے تھے، یوں آٹھ روپے میں ہم چار آدمی سیر ہو کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس کفایت شعاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ماہ ملنے والے اٹھارہ سو روپے میں سے میں ایک ہزار روپے بچا لیتا اور اپنے والد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتا۔

مرزا صاحب مل گئے

دَم دینے کے بعد میں ایک بار پھر حرم شریف میں آ گیا۔ عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد حجرِ اسود کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا، اور اپنے اہل خانہ، اعزا و اقارب اور دوست احباب کے لیے دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔ اچانک میری نظر اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک باریش شخص پر پڑی، چہرہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اس کے باوجود لگا کہ یہ کوئی جان پہچان والے صاحب ہیں، میں نے اپنا دایاں ہاتھ ان کی پشت پر رکھ دیا، انھوں نے مڑ کر دیکھا تو ہم دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، یہ روزنامہ پاکستان کے پریس منیجر مرزا حنیف تھے، روزنامہ پاکستان کے دفتر میں مرزا صاحب سے میری ملاقات کم کم ہی ہوتی ہے کیونکہ میں عام طور پر اپنا کالم یا نظم ایڈیٹر صاحب کو دینے کے لیے دن کے وقت جاتا ہوں اور پریس شام کے بعد چلتا ہے اور ساری رات چلتا رہتا ہے، اس لیے مرزا صاحب بھی عام طور پر رات کے وقت آتے ہیں۔ اتنی شان دار جگہ پر اتنی شان دار ملاقات ہوئی کہ ہم دونوں بے ساختہ بغل گیر ہو گئے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ مرزا صاحب تین دن پہلے مکّہ مکرّمہ پہنچے ہیں، ان کے پاس دراصل سال

بھر کے لیے ملٹی پل ویزا ہے وہ سال میں جتنی بار چاہیں، سعودی عرب آ سکتے ہیں۔ اتنے میں پروفیسر عارف انجم بھی وہاں پہنچ گئے، مرزا صاحب نے بزرگ ہونے کا ثبوت یوں دیا کہ ہم دونوں کو حرم شریف کے باہر واقع ایک بہت بڑے شاپنگ سنٹر میں لے گئے۔ بہت کچھ کھلانے کے بعد کڑک چائے پلائی۔ میں نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ پاکستان میں چھپنے والی میری تحریریں پڑھتے ہیں؟ تو کہنے لگے: ''آپ کی تحریروں کا پہلا قاری میں ہی تو ہوں، اخبار کی کاپی تیار ہوتے ہی میرے پاس آتی ہے، آپ کی شاعری مجھے پسند ہے، آپ کا عمرے کا سفرنامہ بھی بہت دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ آپ سے ملاقات کی خواہش تھی دیکھیے کہاں آ کر یہ خواہش پوری ہوئی ہے''۔

تڑپ رہے نہ رہے

جوں جوں پاکستان واپسی کا دن قریب آ رہا تھا توں توں میرے اندر خانہ کعبہ سے محبت بڑھتی جا رہی تھی، دل چاہتا تھا کہ ہر لمحہ اس کے ارد گرد رہوں۔ میں اللہ کے گھر کی ساری برکتیں اور رحمتیں اپنے اہلِ خانہ، اعزا و اقربا اور دوست احباب کے لیے سمیٹ کر لے جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اگلے روز میں نے دُھلا دُھلایا احرام اٹھایا اور حرم شریف جا پہنچا۔ وہاں سے دو ریال والی بس پکڑی اور مسجدِ عائشہ جا پہنچا۔ احرام باندھا، عمرے کی نیّت کی، دو نفل ادا کیے اور عمرے کے ارکان کی ادائی کے لیے مطاف میں آ گیا۔ پھر وہی سات چکر، استلام، رمل، دو نفل، آبِ زم زم کے دو گھونٹ، صفا و مروہ کی سعی اور حلق، لیجیے جناب ایک اور عمرہ ہو گیا، جی چاہتا تھا کہ آج بار بار عمرہ ہی کرتا رہوں۔ پھر بلاوا آئے یا نہ آئے، یہ تڑپ یہ شوق رہے نہ رہے لیکن سچ یہ ہے کہ اللہ وہ محبوب ہے جو اپنے عشق کی آگ کو سرد

ہونے ہی نہیں دیتا، جو ایک بار اس کے گھر کو چھو لے، دیکھ لے، بار بار اسے چھونے اور دیکھنے کی خواہش کرتا ہے۔

حرم شریف سے باہر نکلا تو بہت سے مرد و خواتین زمین پر کپڑا بچھائے مختلف قسم کی دوائیں، ٹوپیاں، تسبیحیں اور خوشبوئیں فروخت کر رہے تھے، قیمت پانچ پانچ دس دس ریال تھی اس لیے سب لوگ یہ چیزیں خرید رہے تھے۔ میں نے عام استعمال کی کچھ دوائیں خرید لیں کیونکہ لوگ بھی دھڑا دھڑ خرید رہے تھے۔ اچانک دوائیں بیچنے والے نے دائیں طرف دیکھا اور جلدی سے اپنا سامان سمیٹ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں سمجھا کہ پولیس یا بلدیہ کے اہل کار آ گئے ہیں لیکن وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا، باقی لوگ اسی طرح بیٹھے اپنی چیزیں بیچ رہے تھے۔ مجھے دوائیں بیچنے والے کی یہ حرکت مشکوک لگی۔ دواؤں کے ڈبوں پر استعمال کی آخری تاریخ پڑھی تو وہ ایک سال پہلے گزر چکی تھی۔ دوسرے لوگوں کی دوائیں دیکھیں تو ان کا بھی یہی معاملہ تھا۔ اب بات میری سمجھ میں آئی کہ وہ شخص اچانک کیوں بھاگا تھا؟ اس کے پاس ساری ادویات ناقابل استعمال تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا راز فاش ہو اور وہ پکڑا جائے۔ یہ ناقابل استعمال دوائیں سب نے وہیں کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیں، اللہ کے گھر کے آس پاس اس طرح کے کام کرنے والوں تک انسانیّت کا آفاقی پیغام کون پہنچائے گا؟ یہی سوچتے ہوئے میں اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ

۱

اگلے ہی دن ملتان روانہ ہوا۔ والدین کے چہرے دیکھ کر حج کی خوشی تر و تازہ ہو گئی۔ والدہ نے میرے حج کی خوشی میں محفل میلاد کا اہتمام کیا۔ اَعِزّا و اقربا کو مدعو کیا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اگر حجۃ الوداع کے موقع پر پیغمبرِ اعظم حضرت محمدؐ کے والدین زندہ ہوتے تو شاید حج کے بعد کیے جانے والے طوافِ وداع کے بعد والدین کی قدم بوسی کا عمل حج کا ساتواں واجب رکن قرار پاتا۔

گرم میدانوں کا عشق

7اکتوبر 2016ء کو جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ ریحان کو دفتر سے چھٹی تھی اس لیے وہ صبح سویرے ہی میرے پاس جدّے سے مکّہ مکرّمہ پہنچ گیا تھا۔ مَیں اسے بتا چکا تھا کہ 8اکتوبر کو میری روانگی ہے۔ غالباً وہ جان گیا تھا کہ مکّہ مکرّمہ سے واپسی کا دن میرے لیے خاصا اداس کر دینے والا ہو گا اس لیے وہ شاید میری ڈھارس بندھانے چلا آیا تھا۔ پہلے ہم دونوں نے ایک ریستوران سے ناشتا کیا۔ مَیں نے فول تمیز اور خمیری روٹی اور ریحان نے ایک چوری جیسی ڈش منگوائی۔ یہ ڈِش زیتون کے تیل سے بنے پراٹھے، کیلے اور زیتون کے تیل کو ملا کر تیار کی گئی تھی۔ مَیں نے اسی ریستوران میں یہ ڈش تیار ہوتے بھی دیکھی۔ دکان دار ایک پراٹھا، دو کیلے اور بہت سا زیتون کا تیل ایک ہاون دستے میں ڈالتا اور زور زور سے کوٹتا رہتا۔ چند منٹ کے بعد نکال کر پلیٹ میں ڈالتا اور گاہک کے سامنے رکھوا دیتا۔

ناشتے کے بعد ریحان نے گاڑی کا رخ غارِ ثور کی طرف موڑ دیا۔لیکن اس بار بھی وہی ہوا۔ مَیں غارِ ثور تک نہیں پہنچ پایا۔ ریحان کا کہنا تھا کہ اگر ہم اوپر چلے گئے تو جمعۃ المبارک کی نماز رہ جائے گی۔ مَیں خود بھی چاہتا تھا کہ اپنے قیام کے آخری جمعے کی نماز خانہ کعبہ میں ادا کروں۔ یہاں سے نکلے تو ہم میدانِ عرفان کی

جانب جا پہنچے۔ ہر طرف خاموشی، سناٹے، ویرانی اور دھوپ کا راج تھا۔ مسجد نمرہ بھی بند تھی۔ منیٰ کے میدان میں خالی خیمے آئندہ سال کے حاجیوں کے انتظار میں مگن تھے۔ مزدلفہ کا میدان جو ابھی چند روز پہلے دنیا بھر سے آئے ہوئے لاکھوں مسلمانوں کے لیے ایک بستر کی صورت تھا، اب ویران تھا۔ سوائے کنکریوں کے، حاجیوں کی وہاں کوئی ایک بھی نشانی موجود نہیں تھی۔ یہ ویران، اداس اور گرم پتھریلے میدان کتنے خوش قسمت ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمان یہاں آنے کو ترستے ہیں اور جو یہاں ایک بار آ جاتے ہیں، سدا اپنی قسمت پر نازاں رہتے ہیں۔ میرے شوق کا یہ عالم تھا کہ مَیں بار بار ریحان کی ٹھنڈی ٹھار گاڑی سے اُتر جاتا اور ان گرم لیکن مقدس مقامات سے ہم کلام ہو جاتا۔ شاید مَیں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میرا اگلا بلاوا کب آئے گا؟ آئے گا بھی یا نہیں؟ آئے گا تو کب؟ شوق کا یہ سفر تھمنے ہی میں نہیں آتا تھا۔ ریحان مجھے بار بار کہتا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ تاکہ جمعے کی نماز سے پہلے پہلے حرم شریف پہنچ جائیں، لیکن ان گرم میدانوں کا عشق میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا تھا۔

حضرت بلالؓ کی نمازِ عشق

ہم حرم شریف پہنچے تو ہر طرف مخلوق خدا تھی۔ مَیں جمعۃ المبارک کی نماز خانہ کعبہ کے عین سامنے ادا کرنا چاہتا تھا لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ شرطے حرم شریف کے باہر خالی رہ جانے والے مقامات پر نمازیوں کی صفیں بنوا رہے تھے۔ ریحان ان سے بچ بچا کر اوپر جانے والی برقی سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ مَیں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ برقی سیڑھیاں ہمیں حرم شریف کی چھت پر لے آئیں۔ یہاں تیز دھوپ تھی لیکن اس کے باوجود ہزاروں لوگ نمازِ شوق ادا کرنے

کے لیے تپتی ہوئی زمین پر کھڑے ہوئے تھے۔ سو ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ اس نماز نے مجھے حضرت بلال حبشیؓ کی یاد دلا دی۔ شاید سارے نمازیوں کی یہی کیفیت ہو جیسی میری تھی۔ حضرت بلال حبشیؓ نمازِ عشق یوں ادا کرتے تھے کہ اُنھیں اپنے قدموں تلے موجود تپتی زمین اور زنجیروں میں جکڑے جسم پر پڑے بھاری پتھر پھول لگتے تھے۔ نماز ادا کرنے کے بعد مَیں نے ریلنگ کے قریب کھڑے ہو کر نیچے دیکھا تو خانہ کعبہ کے اردگرد لوگ ہی لوگ نظر آئے۔ یہ لوگ نہیں تھے۔ کائنات کا سفر تھا۔ لگتا تھا کہ ننھے ننھے سیارے کعبے کے گرد گھوم رہے ہیں۔ مَیں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ہر روز، ہر لمحہ یہ منظر دیکھ کر:

ہنستا تو ہو گا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

زم زم فیکٹری

حرم شریف سے نکلے تو چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم دونوں زم زم فیکٹری کے سامنے کھڑے تھے۔ مکّہ مکرّمہ کے باشندے اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے لوگ اسٹیل سے بنی ہوئی ٹرالیاں کھینچ کر باہر لا رہے تھے۔ ان ٹرالیوں میں زم زم سے بھری دس دس لیٹر کی بڑی بڑی بوتلیں رکھی تھیں۔ جب ریحان نے مجھے حیرت زدہ دیکھا تو بولا: ”مکّہ مکرّمہ اور دوسرے شہروں میں رہنے والے لوگ یہاں اپنا شناختی کارڈ یا اقامہ دکھا کر اپنے خاندان کے ارکان کی تعداد کے مطابق زم زم کی دس دس لیٹر کی بوتلیں خرید سکتے ہیں۔ دس لیٹر کی بوتل صرف پانچ ریال میں ملتی ہے۔ حاجیوں کو چونکہ صرف پانچ لیٹر کی بوتل اپنے وطن لے جانے کی اجازت ہے اس لیے اُنھیں دس لیٹر کی بوتل فروخت نہیں کی جاتی۔“ ریحان دراصل جانتا تھا کہ میں عقیدت کے اس سفر میں بہت سی حیرانیاں بھی سمیٹنا چاہتا ہوں، اس لیے وہ

مجھے دانستہ یہاں لایا تھا تاکہ مَیں دیکھ سکوں کہ زم زم کس طرح فروخت ہوتا ہے؟ پہلے وہ ایک لمبی قطار میں کھڑا ہوگیا۔ پچیس ریال جمع کروائے اور ایک رسید لے کر قطار سے نکل آیا۔ رسید لے کر وہ ایک سپاٹ دیوار کے قریب گیا۔ یہ واقعی ایک حیرت ناک عمل تھا۔ اس نے رسید دیوار پر لگی ایک الیکٹرانک ڈیوائس کے اندر ڈال دی۔ چند لمحوں کے بعد کھل جا سم سم والا منظر میرے سامنے تھا۔ دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ نمودار ہوگیا، وہاں سے آب زم زم سے بھری دس لیٹر کی ایک بوتل باہر نکلی اور دروازہ بند ہوگیا۔ چند سیکنڈ کے بعد پھر دروازہ کھلا اور دوسری بوتل باہر آگئی۔ باری باری پانچ بوتلیں باہر آگئیں۔ ہم دونوں نے یہ بڑی بڑی اور بھاری بوتلیں ٹرالی میں رکھیں اور گاڑی کی طرف چل پڑے۔

اپنے پڑھنے والوں کو بتاتا چلوں کہ فیکٹری میں خودکار مشینیں لگی ہوئی ہیں، جو نہی رقم ادائی کی رسید ڈیوائس میں ڈالی جاتی ہے، کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے عملے کو علم ہو جاتا ہے کہ کتنی بوتلوں کا آرڈر دیا گیا ہے۔ وہ اتنی ہی بوتلیں اُٹھا کر وہاں لگی ہوئی سامان پہنچانے والی بیلٹ پر رکھ دیتے ہیں جو ایک ایک کر کے باہر آجاتی ہیں۔

ریحان کا تحفہ

مَیں نے ریحان سے پوچھا کہ یہ بوتلیں کس کے لیے ہیں؟ تو بولا: ''یہ سب آپ کے لیے ہیں۔'' ...... ''لیکن یہ سب مَیں کس طرح پاکستان لے جاؤں گا؟'' مَیں نے حیرت اور پریشانی میں ڈوبے لہجے میں پوچھا تو ہنستے ہوئے کہنے لگا: ''نہیں! نہیں! مَیں تو مذاق کر رہا تھا۔ البتہ ان میں سے ایک بوتل ضرور آپ اپنے ساتھ پاکستان لے جائیں گے۔''

یہ بھی ناممکن بات تھی کیونکہ کسی حاجی کو پانچ لیٹر سے زائد آب زم زم لانے کی

اجازت نہیں۔ ریحان بولا: ''پانچ لیٹر کی بوتل بھی آپ اپنے ساتھ لے جائیں گے اور دس لیٹر کی یہ بوتل بھی آپ کے ساتھ جائے گی۔ پانچ لیٹر والی بوتل جہاز میں آپ کے دستی سامان کے ساتھ ہوگی اور دس لیٹر والی آپ کے تیس کلو سامان میں شامل ہوگی۔'' بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن ریحان کا اطمینان دیکھ کر مَیں خاموش ہوگیا۔ میری بے چینی بھانپ کر ریحان گاڑی میرے ہوٹل لے آیا۔ آبِ زم زم سے بھری دس لیٹر کی بوتل اٹھائی اور میرے کمرے میں لا کر رکھ دی۔ بولا: ''اپنے تیس کلو والے بیگ میں اسے رکھ لیجیے۔''

مَیں نے کہا کہ مَیں نے پہلے ہی اس میں چھوٹی چھوٹی کئی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں جن میں خانہ کعبہ سے آب زم زم بھرا گیا تھا۔ اس نے کہا: ''یہ ساری بوتلیں نکال دیں۔'' مَیں نے تعمیل کی۔ اس نے میری بھری ہوئی ایک بوتل ہاتھ میں پکڑی اور تین فٹ کی بلندی سے زمین پر پھینک دی۔ بوتل کا منہ اگرچہ مَیں نے ٹیپ لگا کر بند کیا تھا لیکن آب زم زم رِسنے لگا تھا۔ بولا: ''جہاز میں آپ کا سامان رکھا جائے گا تو یہ ساری بوتلیں کھل جائیں گی اور پاکستان جاتے جاتے سارا آب زم زم ضائع ہو جائے گا۔'' مَیں نے بے چارگی سے کہا: ''پھر بتاؤ! یار! اب مَیں کیا کروں؟'' وہ مسکرایا۔ اس نے دس لیٹر والی بوتل چار فٹ کی بلندی سے زمین پر پھینک دی۔ بوتل بالکل صحیح سلامت تھی۔ زم زم کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرا تھا۔ ''یہ بوتلیں بہت مضبوط مواد سے بنائی جاتی ہیں۔ استعمال سے پہلے ان کے کئی قسم کے ٹیسٹ کیے جاتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان میں دس لیٹر زم زم بھرا جاتا ہے۔ پہلے یہی بوتلیں حاجیوں اور معتمرین کرام کو دی جاتی تھیں اور یہ اس لیے بہت زیادہ مضبوط بنائی جاتی تھیں کہ جہاز میں لوڈ یا ان لوڈ کرتے ہوئے گر کر ٹوٹنے سے محفوظ رہیں۔''

اس کی بات سن کر مجھے اطمینان ہوا۔ مَیں نے اپنی ساری چھوٹی چھوٹی بوتلیں باہر رکھ دیں۔ ان سب کا پانی ملا کر بھی شاید دس لیٹر نہیں ہوگا۔ دس لیٹر کی بوتل اپنے بیگ میں رکھنے کے بعد مَیں نے بیگ کا وزن کیا تو 35 کلو تھا جبکہ ائر لائن والوں نے ہدایت کر رکھی تھی کہ بک کرایا جانے والا بیگ 30 کلو سے زائد نہ ہو۔ ریحان نے تسلی دی کہ دو چار کلو سامان زائد ہو تو ائر لائن والے جانے دیتے ہیں۔ سو مَیں نے 35 کلو کا بیگ بنایا اور اس کے اوپر لیمینیشن کروا لی۔ اب بیگ میں سے سامان نکالا جا سکتا تھا نہ مزید رکھا جا سکتا تھا۔

''البیک'' سے کھانا کھانے اور کھلانے کے بعد ریحان رخصت ہوا اور مجھے ایک بار پھر تنہا چھوڑ گیا۔

طوافِ وداع

18 اکتوبر کو مسجد خدیجہ بنت خویلدؓ میں فجر کی نماز ادا کی تو دل کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ شاندار مسجد میں یہ میری آخری نماز تھی شاید۔ کیفے رحمت سے سموسے اور چائے کا ناشتا کیا۔ جب مَیں نے کیفے رحمت کے بنگالی مالک کو بتایا کہ مکّہ مکرّمہ میں یہ میرا آخری ناشتا ہے تو اس نے مجھ سے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے اصرار پر مَیں نے چار ریال جیب میں ڈال لیے۔ اس نے نہایت گرم جوشی سے الوداعی مصافحہ کیا۔ اس الوداعی نے مصافحے سے مجھے پتا چلا کہ حج ادا کرنے کے بعد، اپنے ملک روانہ ہونے سے پہلے طواف وداع کیوں کیا جاتا ہے؟ جس طرح ہر مہمان رخصت ہوتے وقت اپنے میزبان سے الوداعی مصافحہ یا معانقہ کرتا ہے اسی طرح اللہ کے ہر مہمان کو بھی اللہ تعالیٰ سے الوداعی مصافحہ کرنا پڑتا ہے۔ طواف وداع حج کا چھٹا اور آخری واجب رکن ہے۔ طواف وداع نہ کیا جائے تو دَم

دینا لازم ہو جاتا ہے۔ البتہ عورتوں کو فطری جبر کی وجہ سے طواف وداع معاف ہو سکتا ہے۔ یہ طواف عام لباس میں ہوتا ہے۔ اس میں رمل اور اضطباع نہیں ہوتا۔ البتہ طواف کے بعد دو رکعت واجب طواف ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد سعی بھی نہیں کی جاتی اور بال بھی نہیں کٹوائے جاتے۔ ٹیکسی میں سوار ہو کر حرم شریف پہنچا، طواف وداع کیا اور فوراً ہی واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ہوٹل کے باہر توقیر احمد شریفی صاحب کی کمپنی کی گاڑی مجھے جدے ائیر پورٹ پہنچانے کے لیے کھڑی تھی۔

الحمدللہ

مکّہ مکرّمہ سے رخصت ہوتے وقت آنکھ میں آنسو تو نہیں تھے، البتہ دل اداس تھا۔ لیکن یہ ڈھارس بھی تھی کہ چند گھنٹوں کے سفر کے بعد مَیں لاہور میں اپنے بچوں اور اہل خانہ کے درمیان ہوں گا۔ جدّے پہنچ کر مَیں نے عزیزیہ کے علاقے میں گاڑی رکوائی۔ کبابش ہوٹل سے بڑے کا مغز کھایا۔ مغز کی مقدار کافی زیادہ تھی۔ بچا ہوا چار پانچ روٹیوں کے ساتھ پیک کرا لیا۔ میرے بچوں نے فرمائش کی تھی کہ اس دفعہ ان کے لیے ''البیک'' کا چکن ضرور لاؤں۔ سو راستے میں ''البیک'' سے پانچ ڈبے پیک کرا لیے۔ ائیر پورٹ پہنچ کر اپنا سامان بک کرایا۔ ائیر بلیو والوں نے میرے بیگ کا وزن کیا تو یہ 30 کلو کے بجائے 35 کلو تھا۔ اہل کار نے کہا کہ آپ اس میں سے پانچ کلو وزن کم کر لیں، لیکن اس بیگ کے اوپر لیمینیشن ہو چکی تھی اس لیے اسے کھولا نہیں جا سکتا تھا۔ سو ائیر بلیو والوں نے مجھ سے دو سو ریال طلب کر لیے۔ مَیں نے اچھے بچے کی طرح سو سو ریال کے دو کڑکڑاتے نوٹ ان کے حوالے کیے۔ رسید لی، بورڈنگ کرائی، امیگریشن بھی ہو

گئی۔ آبِ زم زم سے بھری پانچ لیٹر کی ایک بوتل میرے ہاتھ میں تھی جو مَیں
نے ائیرپورٹ ہی سے نو ریال میں خریدی تھی۔ لاؤنج میں پہنچا تو میرے
دوسرے ساتھی بھی پہلے سے موجود تھے۔ جہاز کے اڑنے میں ابھی دو تین گھنٹے
باقی تھی۔ دوستوں نے بھوک کا نعرہ لگایا تو ایک نے بتایا کہ یہاں بہت مہنگا ہے
اس لیے صبر اور جبر سے کام لیا جائے۔ مَیں نے عزیزیہ سے خریدا ہوا کھانا ان
کے سامنے چُن دیا۔ یہ ان کے لیے من وسلویٰ سے کم نہ تھا۔ اس نیکی کا اللہ تعالیٰ
نے مجھے وہیں ایک انعام دے دیا۔ ہوا یوں کہ جب ہم سب جہاز میں سوار ہونے
کے لیے قطار میں کھڑے تھے تو ائیرپورٹ پر موجود ایک اہل کار سیدھا میرے
پاس آیا اور بولا: ''یہ آبِ زم زم چاہیے آپ کو؟'' مَیں نے کہا: ''نیکی اور پوچھ
پوچھ؟'' بولا: ''نکالیے بیس ریال''۔ مَیں نے بیس ریال اس کے ہاتھ پر رکھے اور
آبِ زم زم کی بوتل تھام لی۔ چونکہ اب تلاشی کا کوئی مرحلہ نہ تھا اس لیے یہ بوتل
آسانی سے مَیں نے جہاز میں اپنے ساتھ رکھ لی۔ ساڑھے چار گھنٹے کی پرواز کے
بعد ہوائی جہاز لاہور کی فضا میں تھا۔ چندلمحوں کے بعد جہاز رن وے پر دوڑ رہا
تھا۔ جہاز سے اترنے کے بعد پھر امیگریشن ہوئی یعنی پاسپورٹ پر ٹھپا لگایا گیا۔
الحمدللہ! میرا سامان بھی میری طرح صحیح سلامت پہنچ گیا تھا۔ اس وقت صبح کے 6 بج
رہے تھے۔ اپنی یوفون کی سِم آن کر لی تھی۔ پہلی کال میرے بھائی طاہر کی آئی اس
نے بتایا کہ پورا ٹبر آپ کے استقبال کے لیے ائیرپورٹ پر موجود ہے۔ دوسری
کال شبنم کی آئی، وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ بولی: ''ہم ابھی گھر ہی میں ہیں۔ مَیں
واجد بھائی کے ساتھ ائیرپورٹ کے لیے نکل چکی ہوں۔ جب تک مَیں
ائیرپورٹ نہ پہنچ جاؤں۔ آپ باہر مت آئیے گا۔''

مَیں جو شبنم کی بات کم ہی مانتا ہوں، ہمیشہ اپنی منواتا ہوں، اس بار اس کی
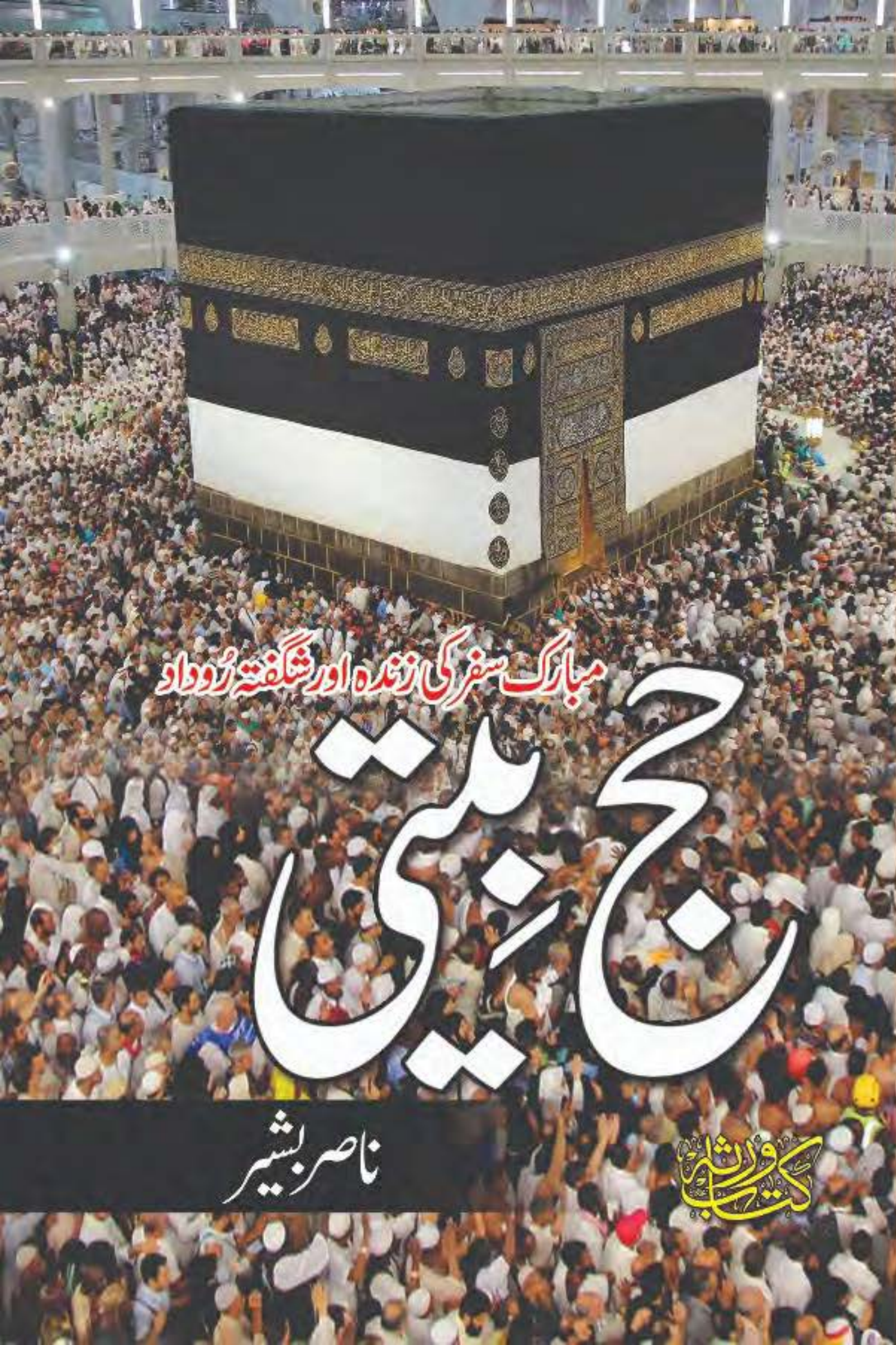
مان گیا۔ اپنے سامان سمیت ائیرپورٹ کے اندر ہی ایک کونے میں رکھے بنچ پر
بیٹھ گیا۔ آدھا گھنٹا گزرنے کے بعد شبنم کی کال آئی۔ اس نے گرین سگنل دے دیا
تھا۔ سو مَیں ائیرپورٹ سے باہر آ گیا۔ میری پرواز سے آنے والے تمام حاجی
صاحبان رخصت ہو چکے تھے اس لیے وہاں مجھے ہر طرف اپنے بہن بھائی اور
رشتے دار دکھائی دیے۔ البتہ شبنم اجالا، احسن، جواد اور ارفع کے ساتھ سب سے
آگے کھڑی تھی۔ پلک جھپکتے ہی مجھے پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا۔ محبت
بھرے لوگوں کا یہ قافلہ سنت نگر پہنچا تو عجیب سماں تھا۔ میری گلی میں استقبالیہ
فلیکس لگے ہوئے تھے۔ ایک پر یہ شعر لکھا ہوا تھا:

مجھے بھی کعبے کو چھونے کی مل گئی اجازت
مرے خدا نے مجھے بھی اپنا بنا لیا ہے

حج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے مَیں، اپنے والد صاحب اور والدہ کو ملنے
ملتان گیا تھا۔ یہ سفر اس بار بھی مَیں نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ اگلے ہی دن
ملتان روانہ ہوا۔ والدین کے چہرے دیکھ کر حج کی خوشی تر وتازہ ہوگئی۔ والدہ نے
میرے حج کی خوشی میں محفل میلاد کا اہتمام کیا۔ اَعزّا واقربا کو مدعو کیا۔ مَیں سوچ رہا
تھا کہ اگر حجتہ الوداع کے موقع پر پیغمبرِ اعظم حضرت محمدؐ کے والدین زندہ ہوتے تو
شاید حج کے بعد کیے جانے والے طوافِ وداع کے بعد والدین کی قدم بوسی کا عمل
حج کا ساتواں واجب رکن قرار پاتا۔

ناصر بشیر کی ''حج بیتی''

ناصر بشیر کسی تعارف یا تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ اردو کے استاد ہیں اور اب تک سینکڑوں کیا ہزاروں نوجوانوں کی ''الف، ب'' سیدھی کر چکے ہیں، لیکن استادی کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاعری میں بھی نام پیدا کیا ہے، اور ایک کالم نگار کے طور پر بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ روز نامہ ''پاکستان'' کے ساتھ ان کی وابستگی ہم سب ''اہلِ پاکستان'' کے لیے ایک اعزاز ہے۔

چند برس پہلے رمضان المبارک کے دوران مجھے امریکہ جانا پڑا، عیدالفطر بھی بوسٹن میں منائی وہاں کی عظیم الشان جامع مسجد میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ عید پڑھنے کا اپنا ہی مزا تھا۔ پاکستانیوں کی بڑی تعداد نے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا، لاہوریوں کی طرح چھپاں ڈال کر بوسٹن کو لاہور بنا دیا۔ ناصر بشیر روزانہ ایک نعت کہہ رہے تھے، جو روز نامہ ''پاکستان'' کی زینت بن کر نشاطِ روح کا سامان کر رہی تھی۔ مَیں نیٹ پر اخبار پڑھتا اور سر دھنتا۔ ایک دن خیال آیا کہ ناصر صاحب کو ادارے کی طرف سے عمرے پر بھجوانا چاہیے۔ انہیں اس سے مطلع کیا تو وہ پھولے نہ سما پائے۔ عمرے کے اس سفر کی روداد انہوں نے لکھی، جو اخبار میں قسط وار چھپی اور پھر کتابی صورت میں ڈھل گئی۔ ان کے اس سفرنامے کو مَیں نے ''نثری نعت'' قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ اسے بھی بارگاہِ حق میں قبولیت کا شرف حاصل ہوگا۔ اس کا ثبوت یوں مل گیا کہ برادرم حاجی مقبول صاحب نے انہیں اپنے ادارے کی طرف سے حج کی پیش کش کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بار پھر مدینے کی فضاؤں میں اڑتے پائے گئے۔ اس ''حج بیتی'' کو بھی انہوں نے قلم کی زبان دے دی ہے۔ وہ اپنے قاری کو اس طرح اپنا رفیق بناتے ہیں کہ وہ خود اس مبارک سفر کا مسافر بن جاتا ہے۔ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ ناصر بشیر کی جگہ وہ خود حج کر رہا ہے۔ حج کے سفرنامے بہت لکھے گئے اور بہت لکھے جائیں گے لیکن ناصر بشیر کی ''حج بیتی'' اپنی بے ساختگی کی وجہ سے یاد رہے گی۔ ''حج بیتی'' پڑھنے والے ہر شخص کو یہ ''ہڈ بیتی'' محسوس ہوتی ہے اور وہ سراپا دعا بن جاتا اور ناصر بشیر کا یہ شعر گنگناتا ہے:

دل مدینے کا ہوا اور مدینہ میرا
شکر الحمد کہ روشن ہوا سینہ میرا

مجیب الرحمٰن شامی

For Book Lovers
Kitab Virsa
Ghazni Street, Urdu Bazar Lahore
www.kitabvirsa.com
kitabvirsa@gmail.com - 0333-4377794

حج بیتی
ناصر بشیر
کتاب ورثہ

مبارک سفر کی زندہ اور شگفتہ رُوداد

حج بیتی

ناصر بشیر

کتاب ورثہ